# الخلافت

مصنف و مؤلفہ

ملک محمد طفیل

# الخلافت

## گزارش

یہ خلافت کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ اس میں اس بات کے دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے عزّوجلّ نے کس لیے انسان اور انسان کو ہی دیگر مخلوقات پر ترجیح دے کر اس دنیا میں اس کو اپنی نیابت کے لیے بھیجا۔ اور پھر قیامت تک انسان کے جدّ اوّل حضرت آدمؑ کی نسل کو دنیا کا وارث بنا کر خلافت کو اس میں قائم رکھا۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر کی خلافت کو نہایت ہی مدلّل طریقہ سے بتانے کے بعد اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس میں اور خلافت اسلامیہ میں کیا فرق تھا۔ اور ان دونوں میں مقابلہ کر کے ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے کہ خلافت اسلامیہ ہی دنیا کی آخری خلافت ہو سکتی ہے۔ اور اسی سے اس کا نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اللہ جلّ شانہ نے آنحضرتؐ کو صرف اس لیے اس عالم میں مبعوث فرمایا کہ رب العزّت والدّین کے نام سے ایک ایسا دستور العمل دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ جس سے انتظام عالم نہایت ہی بہترین طریقہ سے انجام پا سکے۔

بہت کم مسلمان ایسے ہوں گے۔ جو کہ خلافت کے حقیقی مقصد اور مدعا سے واقف ہیں۔ ان کو بلا انکار خلیفۃ المسلمین سے نہایت ہی گہری عقیدت اور ارادت ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کے معلوم کرنے کی کبھی بھی زحمت نہیں اُٹھائی ہو گی کہ خلیفہ وقت کا وجود کس لیے ضروری ہے اور اس میں کون کونسی صفات ہونی چاہئیں۔ اور دنیائے اسلام پر اس کا اقتدار کس درجہ تک ہے اور اس پر عامۃ المسلمین اور خدائے عزّوجلّ کے کون کون سے حقوق ہیں۔ اور نیز اہل اسلام کو خلافت کے امورات میں کس قدر دخل ہے۔

خلافتِ اسلامیہ کی تاریخ بذاتہٖ ایک نہایت ہی دلچسپ تاریخ ہے۔ ہر ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصلیّت سے واقفیّت حاصل کرے اور معلوم کرے کہ اس کو خلیفہ وقت کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اور کہ یہ تعلق کسی کے توڑنے سے ٹوٹ نہیں سکتا ہے۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کا مذہبی پیشوا ہے بلکہ دین کے ساتھ ان کے دنیوی امورات کا بھی کفیل ہے۔ لیکن ان سب باتوں کا علم صرف اسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ جس قدر واقعات بھی اس کے متعلق شروع سے لے کر اب تک گزرے ہیں ان کو بغور مطالعہ کر کے خلافت کے موجودہ

زوال کے اسباب معلوم کئے جائیں۔

اس کتاب میں اسی خیال کو مدِّ نظر رکھ کر آنحضرتؐ کی بنیادِ خلافت کے وجوہات بیان کرنے کے بعد اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے متعلق جو اختلاف اُمّت میں واقع ہوا تھا اس پر مدلل طور سے بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہ اختلاف محض اختلاف رائے تھا ورنہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ پھر حضرت عمرؓ کے شاندار عہد پر روشنی ڈال کر ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ ایک خلیفہ کے لیے آپؓ کی زندگی کے واقعات چراغ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں، اور خلافت کی شان کی اصلی تصویر آپ کے ہی عہد مقدس سے مل سکتی ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے واقعات خلافت پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور تاریخی حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ ان فسادات کی اصلیت کیا تھی جو کہ آپؓ کی شہادت کا باعث ہوئے، اور جن سے اسلام میں آئندہ خونریزی کے واقع ہونے سے نفسِ خلافت کو کس قدر نقصان پہنچا۔ آپ کے عہد کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت زیر بحث لائی گئی ہے، اور نہایت ہی معتبر اور مُستند تواریخ کے حوالوں سے دکھلایا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت میں معاویہؓ کی بغاوت نے اسلام میں آئندہ کے لیے نفاق کا بیج بونے کے ساتھ ہی اس کو جمہوریّت سے شخصیت میں تبدیل کر دیا۔ پھر معاویہؓ کے طرزِ عمل پر تنقید کر کے اس بات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاویہؓ ہی اسلام میں سب سے پہلا شخص ہوا ہے جس نے آنحضرتؐ کے قائم کردہ اصول جمہوریت کو مسترد کر کے اپنے منگھڑت اصول قائم کیے جن سے خلافت کی حیثیت کو نہایت ہی نقصان پہنچا، اور خلفائے مابعد میں خود پرستی، عیش و عشرت، تکبر، تمکنت اور بے جا رُعب کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کی گردنوں میں غلامی کا طوق ڈلوایا۔ اس کے بعد معاویہؓ کے جانشینوں کی خلافت معرض بحث میں لائی گئی ہے، اور روایۃً و درایۃً دکھلایا گیا ہے کہ انہوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت کو سلب کر کے بے جا خونریزی، ظلم اور استبداد پھیلا کر حریّت و آزادی کا خون ہی کر دیا۔

اس کے علاوہ واقعہ کربلا کو علیحدہ طور سے ایک فصل کی صورت میں پیش کر کے اس عہد کے مسلمانوں کی بے انصافی اور حرص و آز کا نقشہ دکھلایا گیا ہے۔ آخری تین فصلیں اُمید ہے نہایت ہی دلچسپ ثابت ہوں گی۔ ان میں مدینہ منورہ سے مرکز خلافت کے انتقال، فرائض خلیفہ اسلام اور اسباب انحطاطِ اسلام پر بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے اوّل الذکر فصل میں ثابت کیا گیا ہے کہ مدینہ منورہ سے خلافت کا انتقال گویا اسلام کے تنزل کا پیش خیمہ ہے، اور اسی نے مسلمانوں میں حریّت، آزادی، اور

مساوات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ اور دونوں مؤخر الذکر فصلوں میں خلیفہ کے فرض منصبی اور اسباب زوال اسلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ بات قابل توجّہ ہے کہ واقعاتِ خلافت کے بیان کرنے میں میں نے کسی خاص فرقہ پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ نہایت ہی آزادی کے ساتھ حقیقت کو ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ وہ لوگ جو کہ ضد، ہٹ اور ناانصافی کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہیں کئی وجوہات کے باعث مجھ سے اظہارِ رنج کریں گے۔ لیکن مجھے اس سے کسی قسم کا خوف نہیں کیونکہ میں نے محض خوشنودیٔ خدا اور رسول اللہؐ کے لیے خلافت اور اسلام کے موجودہ زوال کے اسباب دکھلانے کے ساتھ مومنین سے جو کہ دل میں اسلام کا درد رکھتے ہیں اپیل کی ہے کہ وہ تمام پہلوؤں پر غور کر کے انصاف سے کام لے کر اپنی دیرینہ ضد اور ہٹ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے مقدّس مذہب کی فلاح اور بہبودی کی طرف متوجّہ ہوں۔ مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ امیر معاویہؓ کے طرز عمل کے متعلق میری نکتہ چینی ان مسلمانوں کو جو کہ بلاوجہ آپ کے کاموں کو کسی دوسرے فریق کو زک دینے کے لیے نگاہِ تحسین سے دیکھتے ہیں نعل در آتش کے مجھ سے نفرت کے اظہار کرنے پر مجبور کرے گی۔ لیکن میری اُن سے بھی یہی درخواست ہو گی کہ وہ واقعات پر نظر کریں، اور اپنے دل میں ٹھنڈے دل سے غور کر کے نتیجہ نکالیں کہ آیا میری تحریر واقعیت سے کس قدر مطابقت رکھتی ہے۔

میں نے بنی عباس اور عثمانی ترکوں کی خلافت کے واقعات کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ ان کے عروج و زوال کے اسباب کے تذکرہ کے لیے ایک دفتر چاہیے جس کے لیے اس چھوٹی سی کتاب میں گنجایش نہیں ہو سکتی۔ ہاں البتہ بنی عباس کے حصولِ خلافت کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے چونکہ ان دونوں عظیم الشّان خاندانوں کی خلافت تاریخ اسلام میں ایک ممتاز جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس لیے اس کے متعلق میں نے یہ التزام کیا ہے کہ ''الخلافت'' کے دُوسرے حصّہ میں اس کو جگہ دی جائے۔

خاکسار
محمد طفیل

# الخلافت

# پہلی فصل

## ابتدائے خلافت

زمین وآسمان، چاند سورج اور ستارے غرضیکہ جو کچھ بھی ہم اپنے گرد و پیش دیکھتے ہیں سب قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اور پھر ان کے ساتھ ہی انسان کو پیدا کر کے ان تمام کو ان کے تابع کرنا ایک ایسا فعل ہے، جو بادی النظر میں ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اللہ جلّ شانہ کا ان کو ظہور میں لانے سے صرف یہی مقصد ہے کہ اپنی شان و قدرت کو منوایا جائے۔ اور کائنات عالم میں ایک ہی قسم کا دور جاری رکھنے کے بعد پھر نیست و نابود کر کے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ سرسری نظر میں یہ بات دکھلا دیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ کریمی سے اس دنیا اور دیگر اشیاء کو پیدا کر کے نظام عالم کے لیے صرف انسان کو ہی اس قابل خیال کیا کہ وہی اُس نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

نہایت ہی معتبر تواریخ اور مُستند کتب کے حوالے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جب اللہ جلّ شانہ نے زمین آسمان، آفتاب ماہتاب اور ستاروں کی آفرینش سے فراغت حاصل کی تو اپنی قدرت سے فرشتوں کے ایک گروہ کو آگ سے پیدا کر کے ان کو ''جنّوں'' کے نام سے تعبیر کیا اور پھر اُن کو حکم دیا کہ سب کے سب زمین پر اُتر کر اس کی عبادت اور پرستش میں مشغول ہوں۔ اُن کی سرداری کی فضیلت ایک ایسے فرشتہ کو دی گئی جس کو ابلیس کہا جاتا ہے لیکن جس کا اصلی نام عزازیل تھا۔ اگرچہ ابلیس کو اُن کی افسری کا فخر حاصل تھا، لیکن اس کی سکونت آسمانوں پر ہی تھی تاکہ دیگر فرشتگاں کی شمولیت میں جو کہ نور سے پیدا کئے گئے تھے عبادتِ الٰہی میں مصروف رہے۔

علاوہ ازیں خدائے عزّوجلّ نے اس کو بہشت کا دربان اور خازن بھی مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ اس طرح تین ہزار سال کا عرصہ گزر گیا اور ان جنّوں کو اللہ تعالیٰ کے خلاف سرکشی کرنے کا خیال گزرا اور خونریزی پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر اللہ جل شانہ کی غیرت جوش میں آئی اور اس نے ان کو جنگلوں، جزیروں اور پہاڑوں پر تتر بتر کر دیا۔

بعدہ، مانوری فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ زمین پر اُتر کر ابلیس کی سرپرستی میں عبادت الہیٰ کریں، اور اُس کو زمین کی بادشاہت دی گئی۔

چونکہ ابلیس کی حکومت کثیر التعداد فرشتوں پر تھی، اور زمین کی وسیع مملکت کا مالک بنادیا گیا تھا، اس لیے اس کے وہم میں یہ بات سما گئی کہ مجھ جیسا کون ہے۔ میں اس قدر فرشتوں پر حکمران ہوں، اور میرے قبضہ اقتدار میں اتنی بڑی مملکت ہے۔ یہ میں ہی ہوں کہ اس قدر جنّوں سے میں نے ایسی آباد زمین چھین لی ہے، اور اس پر بادشاہت کرتا ہوں۔ بدیں وجہ مجھ سے زیادہ کون طاقتور ہو سکتا ہے۔

ان باتوں سے اللہ تعالیٰ کو نفرت ہوئی اور خیال ہوا کہ اس اپنی مخلوق کو یہ بتادینا چاہئے کہ میری عنایت اور مہربانی پر اس قدر غرّہ نہ ہوں کیونکہ میں نے ہی ابلیس کو اس قدر طاقت اور قدرت دی ہے کہ اتنی مدّت تک وہ زمین پر میری پرستش کرتا رہا، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس نے اس قدر عبادت کی تھی کہ دیگر فرشتگاں اس بات پر متعجّب تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان فرشتوں کو حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس کی توفیق دیتا ہے۔

اب خدائے عزّوجل نے ایک ایسی مخلوق پیدا کرنی چاہی جو کہ حقیقی معنوں میں اس کی عبادت کی اہل ہو سکتی تھی۔ فرشتوں کو اس نے ایسے قویٰ عنایت کئے ہوئے تھے جو کہ صرف اسی کام آسکتے تھے جس کے لیے وہ بنائے گئے تھے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی نفسانی خواہشات نہیں لگی ہوئی تھیں۔ اور نہ ہی ان کو کھانے یا پینے سے سروکار تھا۔ ان کو صرف اسی بات کے لیے پیدا کیا گیا تھا کہ اس کی تسبیح کرتے رہیں، اور بس۔ اگر بدیں وجوہات وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اور کرتے ہیں تو کون بڑی بات ہے۔ مزہ تو جب تھا کہ انسانوں کی طرح ہر ایک قسم کی خواہشاتِ نفسانی رکھتے ہوئے اگر وہ اس کی اسی طرح عبادت کریں جس طرح کہ ان کا معمول تھا، تو البتہ قابل تعجّب ہے۔ چنانچہ اسی لیے اللہ جلّ شانہ کی مشیّت اس بات پر ظاہر ہوئی کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جو کہ باوجود ہر ایک قسم کی خواہشات نفسانی اپنے اندر رکھ کر اس کی شانِ کریمی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے حضور اپنی پیشانی رگڑ کر اپنی انکساری کا ثبوت دے۔

ان باتوں سے بھی گزر کر ایک اور خیال جو ہمیں سوجھائی دیتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہ نے اس دنیا کو پیدا کیا، اور اس میں ہر ایک قسم کے اسباب مہیا کیے، اور تمام طرح کی آسایشیں بہم پہنچائیں۔ تو ضرور ہوا کہ اس کے انتظام کے لیے ایک ایسی ہستی ہونی چاہیے جو کہ اپنے اندر اُس کی رحمت اور عنایت سے ایسی طاقت رکھتی ہو

جس کے ذریعہ سے اس مملکت عظیم کا انتظام بوجہ احسن انجام پاتے ہوئے اصلی معنوں میں خدائے عزوجل کی نیابت اور خلافت کا حق ادا ہو سکے۔ آخر اس خدائے مطلق نے فرشتوں کو اس مطلب کے لیے ناکارہ ہی تصور کر کے ابلیس اور دیگر فرشتگاں کی طرف یہ حیرت انگیز پیغام روانہ کیا۔ ''میں تمہارے سوا زمین پر ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو تم سے افضل تر ہو گی، اور تم سے یہ زمین چھین کر اس کو دیدو نگا اور اس کو اپنا خلیفہ بنا کر خلافت کو اس کی اولاد میں قائم رکھوں گا۔''

اللہ اللہ کیا شان کریمی اس بات سے ٹپکتی ہے۔ خدائے عزوجل نور سے پیدا کردہ فرشتوں پر اس خاکی انسان کو ترجیح دیتا ہے اور اسی کو اپنا خلیفہ بناتا ہے کیونکہ وہ اسی کو ہی اس کا اہل سمجھتا ہے۔ کیا اس سے زیادہ عمدہ ثبوت انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا مل سکتا ہے۔ ہر گز نہیں۔ ہم انسان ہیں کہ باوجود اس کی اس قدر مہربانیوں اور نوازشوں کے جو اس نے ہمارے حال پر مبذول فرمائی ہیں اور ہم کو نوری اور ناری مخلوق پر فضیلت دی ہے، اس کی نعمتوں کا کُفران کرتے ہیں اور اس کے کبھی بھی شکر گزار نہیں ہوتے۔ خدائے عزّوجل کو اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس شہنشاہ کی طرح جو اپنی وسیع مملکت کے انتظام کے لیے اپنے نائب کا تقرر کرتا ہے تاکہ رعایا کو بسبب اُس کے نزدیک ہونے کے کلی طور سے اپنے آقا کے احکام پہنچا سکے اور اُن کے لیے ہر ایک قسم کے آرام اور آسایش مہیا کر سکے وہ قادر ذوالجلال اس انسان کو ہی اپنی نیابت کے لیے منتخب کرتا ہے جس کو وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر اُس میں رُوح پھونکتا ہے۔

جب فرشتوں نے اس ارشاد باری کو سُنا تو گھبرائے کہ یہ زمین ہمارے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے، اور کہنے لگے۔ ''کیا تو ایک ایسی مخلوق دنیا میں پیدا کرنے والا ہے جو کہ یہاں خونریزی کرے گی۔ اور ہم تو تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں۔'' ارشاد ہوا، ''میں جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ بلا انکار وہ لوگ فساد اور خونریزی برپا کریں گے، لیکن اُن میں انبیاء، اولیاء، علماء، صلحاء، زہاد اور عباد پیدا ہوں گے جو مجھے پہچانیں گے۔'' جب اُنہوں نے معلوم کیا کہ خدا تعالیٰ ہر آئینہ انسان کو پیدا کر کے ہی چھوڑے گا جو کہ اس زمین کا مالک اور وارث ہو گا، تو انہوں نے گمان کیا کہ وہ ضرور فرشتوں سے زیادہ نورانی ہو گا۔ اور اگر وہ اس امر کے خلاف ہو گا، اور اللہ تعالیٰ اس کو زمین کی بادشاہت دے گا، تو وہ اس کے فرمان سے ضرور برضرور باہر ہو جاوے گا۔ پھر یہ ہو گا کہ ہم اس سے زمین کو چھین لیں گے، اور جنگ کر کے جنّوں کی طرح اُس کو بھگا دیں گے۔

چونکہ اللہ جلّ شانہ اُن کے دلوں کے بھید جانتا تھا اس لیے وحی بھیجی۔ ''تم کہتے ہو کہ وہ فرشتوں سے زیادہ

نورانی ہو گا، لیکن ایسا نہیں۔ میں اس کو مٹی سے پیدا کروں گا اور یہ زمین اس کو دے دوں گا۔'' جب نوبت یہاں تک پہنچی تو ابلیس نے خیال کیا کہ اللہ جلّ شانہ زمین مجھ سے نہیں چھین سکے گا کیونکہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ مٹی سے۔ آگ مٹی سے اس وجہ سے افضل ہے کہ آگ کی جگہ آسمان کے نیچے ہے اور مٹی کی جگہ زیر زمین ہے۔ پس جو کوئی اوپر ہے وہ زیادہ بزرگ ہے۔

یہ تھا اُس سرکش ابلیس کا خیال، اور وہ تھا اللہ جلّ شانہ کا ارادہ۔ کیا گمراہ انسان یہ بات خیال میں نہیں لاتا کہ خدا تعالیٰ نے اُسے کس قدر برتری بخشی ہے کہ وہ فرشتے جو کئی ہزار سال سے اس کی عبادت کرتے آئے تھے، اور جن کا کام سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں تھا کہ اُس کی تسبیح اور تقدیس کریں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک خاکی انسان کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ انسان کو چاہئے کہ اس سے عبرت حاصل کرے کہ خدائے عزّوجل تو اس سے اس قدر گرویدگی کا اظہار کرتا ہے اور وہ سرکشی کرنے میں دریغ تک نہیں کرتا۔

اب ذرا سُنئے، اس انسان کو وہ کس ناز و نعم کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور پھر تمام دنیا کی نعمتیں اُس کے حوالے کر کے اسی کو اور خاص اسی کو اس زمین پر خلیفہ بناتا ہے۔ چنانچہ جب مشیّت ایزدی انسان کے پیدا کرنے پر پختہ ہو گئی، تو اللہ جل شانہ نے جبرئیلؑ سے ارشاد کیا، ''اے جبرئیل! ہر ایک قسم کی ایک مُشت بھر مٹی اُٹھا لاؤ، تاکہ انسان کو اُس سے پیدا کروں۔'' حضرت جبرئیلؑ ارشاد باری کے مطابق اس مقام پر پہنچے جہاں خانہ کعبہ ہے اور چاہا کہ مٹی اٹھائیں۔ زمین اُن کے ہاتھ کے نیچے لرزی اور یوں گویا ہوئی، ''کیا کرنے لگے ہو؟'' آپ نے کہا، ''ایک مُٹھی بھر مٹی لیتا ہوں، تاکہ اسے ربّ العزت کی درگاہ میں لے جاؤں کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ اس سے انسان پیدا کر کے اس کو تجھ پر قائم کرے۔'' زمین بولی، ''اے جبرئیلؑ! میں نہیں جانتی کہ یہ انسان جو کہ مٹی سے پیدا کیا جانے والا ہے، خدائے عزّوجل کا فرمانبردار ہو گا یا کہ نہیں۔ تجھے خدا کے اس حق کی قسم ہے جو کہ اس کا تیرے سر ہے۔ واپس ہو جا اور اسے مجھ سے نہ لے''۔ جب حضرت جبرئیلؑ نے یہ عظیم الشان سوگند سُنی تو واپس ہو گئے، اور خدائے عزّوجل سے عرض کی، ''اے باری تعالیٰ! زمین نے مجھے قسم دی ہے کہ میں اُس سے مٹی نہ لوں۔ اور اسے لیے میں خالی ہاتھ واپس آ گیا ہوں۔ ''

اس پر اللہ جل شانہ نے میکائیل کو بھیجا لیکن وہ بھی یہی جواب لے کر واپس آ گئے۔ پھر حضرت اسرافیلؑ روانہ کئے گئے مگر وہ بھی اسی طرح لوٹے۔ آخر کار حضرت عزرائیل گئے۔ جب زمین نے ان کو اسی قسم کی سوگند دی تو انہوں نے کہا، ''میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تیری قسم کی وجہ سے خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔'' اور مُشت بھر

مٹی اُٹھا کر درگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو گوندھا گیا اور پھر کچھ مدّت رکھنے کے بعد اس سے آدمؑ کا بُت بنایا گیا۔

ملاحظہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے کس طریقہ سے حضرت آدمؑ کا پتلا بنایا اور پھر اُس میں رُوح پُھونکا۔ چونکہ خدائے عزّوجل انسان کو اشرف المخلوقات بنانے والا تھا اس لیے فرشتوں سے بھی اس کی فضیلت منوانے کے لیے اُن کا حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کرو۔ چنانچہ سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ ''میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں، اور یہ مٹی سے۔'' اللہ جل شانہ کو غصّہ آیا اور اس حکم عدولی کے لیے اس کو راندیا جس کے بعد وہ اُس کی رحمت سے محروم ہو کر آوارۂ جہاں ہو گیا۔

یہاں ہمارا مقصد حضرت آدمؑ کی پیدایش پر بحث کرنا نہیں ہے بلکہ یہی دکھلانا ہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نیابت کے لیے قائم کیا، اور اس کی آفرینش کس عجیب و غریب طریقہ سے کی۔ باوجود اس بات کے کہ اس نے اس سے پیشتر ایک ایسی مخلوق پیدا کی تھی جو کہ نُور سے تھی، اور ہر حالت میں اللہ جل شانہ کی فرمانبرداری اور اطاعت پر آمادہ تھی۔ لیکن اس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور اس خاکی انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر اس زمین پر بھیجا اور اسی کو اس قابل بنایا کہ دنیا کی وسیع مملکت کا انتظام خدائے عزّوجل کے نام سے انجام دے۔ سب سے اوّل خلیفہ حضرت آدمؑ تھے۔ پھر جیسا کہ ارشاد باری ہے، اس خلافت کو اُن کی اولاد میں قائم رکھا اور وقتاً فوقتاً صحیح طور سے نیابت کی ادائیگی کے لیے اس کو تازہ بتازہ احکام کے ذریعہ بیدار رکھا گیا تاکہ اپنے فرائض کو نہ بُھول جائے۔ اب دوسری فصل میں ہم اس بات پر بحث کریں گے کہ رسالت مآبؐ سے پیشتر خلافت کی کیا نوعیت تھی اور پھر آپؐ کس قسم کی خلافت کے بانی ہوئے ہیں۔

# دُوسری فصل

## خلافت قبل از سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت آدمؑ کی پیدائش کے بعد زمین کی خلافت اُن کی اولاد کے لیے مخصوص کر دی گئی، چنانچہ از ابتدائے آفرنیش ہم دیکھ رہے ہیں کہ خلافت انسان کے ہی قبضہ میں ہے۔ لیکن چونکہ انسان دنیا کے اس وسیع تختے پر پھیلے ہوئے ہیں اس لیے یہ لازمی امر ہے کہ خلافت کے امورات کو وہی انجام دے سکتے ہیں جو کہ ان میں سے اس کے اہل ہیں۔ سرسری نظر میں کسی بادشاہ کا نائب وہی ہو سکتا ہے جو کہ اپنے اندر تمام وہ قابلیتیں رکھتا ہو جو حق نیابت کی ادائیگی کے لیے از بس ضروری ہیں۔ اگر اس میں کسی قسم کا نقص واقع ہوتا ہے تو اس سے یہ مقصد نہیں کہ اب بھی وہ اسی منصب جلیلہ کے قابل ہے بلکہ اس کو اس کے ناقابل تصور کر کے برطرف کر دیا جاتا ہے یا اسے اس کی لغزشوں کی سزا دے جاتی ہے۔ اسی لیے اللہ جل شانہ نے ان قوموں کو جو کہ اس کی سرکشی میں حد سے تجاوز کر گئی تھیں بار بار متنبہ کرنے کے بعد دنیا سے اس طرح نیست و نابود کر دیا کہ اب ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا، اور ان کی جگہ اپنے نیک بندوں کو قائم کر دیا کیونکہ اللہ جل شانہ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے، ''کہ زمین کے وارث اس کے نیک بندے ہوں گے۔'' اس کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ بندے جو کہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا حق ادا کر سکتے ہیں اس زمین کے وارث ہوں گے۔ ورنہ وہ جو ہر ایک قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہیں ہر گز ہر گز کسی قسم کا حق اس کی وارثت میں نہیں رکھتے۔

حضرت آدمؑ کو اسی لیے پیدا کیا کہ اُسے اور اُس کی اولاد کو اس زمین کا وارث کیا جائے تاکہ اس وسیع مملکت کا انتظام کریں، اور اُس (اللہ) کی شانِ اُلوہیّت کو گائیں۔ چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے۔ ''ہم نے انسانوں اور جنوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔'' ہمارے خیال میں وہ ہر ایک بات عبادت الٰہی میں داخل ہے جو کہ اس زمین کے حُسنِ انتظام کے لیے کام میں لائی جا سکتی ہے۔ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو قائم رکھنا اور مخلوق کو اُس کی شانِ عظیم سے آگاہ کرتے ہوئے اُسے تمام قسم کی بُرائیوں اور شر سے روکنا ہی عبادت ہے۔

پہلے پہل رب اللہ جل شانہ نے اس زمین کو پیدا کیا تو اُس میں صرف ایک ہی انسان تھا یعنی حضرت آدمؑ۔

پھر آہستہ آہستہ اُن کی اولاد پھیلتی گئی اور یہاں تک بڑھی کہ زمین کا چپّہ چپّہ اُس کے قبضۂ اقتدار میں آگیا۔اب صورت یہ ہوگئی کہ یہ لوگ مختلف قسم کے فسق وفجور میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے اور اسکے حلقہ اطاعت سے باہر ہوگئے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ زمین میں اُس کے نام سے حکومت کرے اور اس کی برتری اور فضیلت قائم رکھے۔لیکن برعکس اس کے اب اُس نے خدائے عزّوجل کی ہستی سے ہی انکار کرنا شروع کر دیا۔اور چہ جائیکہ دنیا میں امن وامان قائم رکھتا،خونریزی اور فساد پر آمادہ ہوگیا۔

لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کا فرشتوں کو ارشاد تھا کہ اگرچہ تمہارے قول کے بموجب انسان دُنیا میں خونریزی کریں گے، لیکن ان میں انبیاء،اولیاء اور صلحاء پیدا ہوں گے جو کہ اس فساد کو روکیں گے،اور دنیا میں امن قائم کریں گے،اور میری خلافت کو برقرار رکھیں گے۔چنانچہ اسی مقولہ کے مطابق حضرت آدمؑ سے لے کر رسالت مآبؐ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے بے انتہا خلفاء زمین پر روانہ کئے جن کی تعداد کم و پیش ایک لاکھ چوبیس ہزار(124000)تک پہنچتی ہے۔ان کا مشن یہ ہوا کرتا تھا کہ گمراہ انسانوں کو راہ راست پر لا کر اللہ تعالیٰ کی واحدنیت کا ڈنکہ بجوایا جائے۔ان کا انتظام مملکت میں صرف اسی قدر دخل ہوا کرتا تھا کہ اگر کہیں انسانوں کا گروہ سرکشی پر آمادہ ہے تو اس کو دلائل اور براہین سے دکھلایا جائے کہ سرکشی تمہارے حق میں زہر کا حکم رکھتی ہے،اور جو کچھ کہ تمہاری پیدایش کا مقصد ہے اس کو نبھاتے جاؤ۔ان خلفاء کو نظام عالم میں محض اتنا ہی اختیار تھا کہ وہ انسان جو خودسری، تکبر اور تمکنت میں اس درجہ بڑھ گئے ہوئے تھے کہ کسی کو بھی اپنے زعم میں نہیں لاتے تھے۔اور یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اللہ جل شانہ کی ہستی تک سے انکار کرتے تھے۔ان کو راہ راست پر لا کر خدا تعالیٰ کی ہستی ان سے منوائی جائے،ان کو امورات دنیوی میں کسی قسم کا دخل نہیں ہوا کرتا تھا۔ان میں سے صرف چند ایک ہی ہوئے ہیں جن کو دینی ودنیوی اقتدار ایک ہی وقت میں حاصل تھا ورنہ سب سے زیادہ ان کی طاقت روحانیت میں ہی مضمر تھی،اور اُن کا مقصد اولیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا سکہ ہی بٹھوانا تھا۔چنانچہ یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں جو بڑی بڑی سرکش قومیں اور خودسر بادشاہ ہوئے ہیں ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے ساتھ اکثر انبیاء آتے رہے ہیں تاکہ ان کو نافرمانی اور سرکشی سے روکیں،اور خدائے عزّوجل کی واحدانیت ان کے دلوں میں قائم کریں۔ان انبیاء کرام کی کبھی بھی یہ خواہش نہیں رہی کہ سلطنتیں قائم کر کے جہانداری اور حکمرانی کا سکہ بٹھایا جائے بلکہ سرکشوں کو راہ راست پر اور فاسقوں کو نیکی کی طرف مائل کرنا ہی ان کے فرائض میں داخل تھا۔

اور ایک اور لطف یہ ہے کہ قبل از سرور کائناتؐ ایک ایک وقت میں کئی کئی انبیاء مبعوث ہوا کرتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کرتا کہ قریب قریب کی بستیوں میں دو دو تین تین نبیؑ مبعوث ہوتے جو کہ مختلف اقوام کے سامنے وعظ کہا کرتے۔ اور یہ تو بسا اوقات ہوا ہے کہ اگر کوئی قوم سرکش ہو گئی ہے تو اُس میں سے ایک خلیفہ بنایا گیا ہے جو کہ ان کا رہبر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مدین والوں کے لیے ان کا بھائی شعیبؑ، عاد و ثمود وغیرہ کے لیے ہودؑ اور صالحؑ ہوئے ہیں۔ انہوں نے صرف یہی کچھ کیا کہ اپنی قوموں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور خدائے عزوجل کے انعامات کا یقین دلایا۔ چونکہ ایک ہی وقت میں کئی کئی انبیاء ہوا کرتے تھے اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک نبیؑ صرف اسی قوم کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا جس میں وہ مبعوث کیا جاتا ہے، اور اس کو دیگر اقوام سے کسی قسم کا سروکار نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے وعظ کا دائرہ صرف اسی حلقہ کے اندر رکھا کرتا جو کہ اس کے فرائض کی ادائیگی کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا۔ لیکن برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کافتہ الناس کے لیے تھے اور ان کی بعثت تمام دنیا کے لیے مختص کر دی گئی تھی۔ یہاں اس سے بحث نہیں۔ آپ کی بعثت اور خلافت کا ذکر آئندہ آئے گا اور ثابت کیا جائے گا کہ آپؐ کی بعثت کیوں تمام عالم کے لیے تھی۔ اس جگہ صرف یہی دکھلانا ہے کہ آپؐ سے پہلے خلافت کی کیا صورت تھی۔ آیا خلیفہ کو وہی اقتدار حاصل تھا جو کہ آپؐ کے بعد کے خلفاء کو ہوا ہے۔ یا یوں کہیے کہ آپؐ کی قائم کردہ خلافت اور آپؐ سے پیشتر کی خلافت ایک ہی قسم کی تھی۔

خلافت اسلامیہ اور خلافت قبل از اسلام ایک بات میں تو مشترکہ تھی، ایک میں جُدا۔ مشترکہ اس میں کہ دونوں کے فرائض میں داخل تھا کہ ایک ہی طریقہ سے اللہ جل شانہ کی واحدانیت اور اس کی پرستش کی اشاعت کی جائے۔ لیکن جُدا اس بات میں کہ خلافت قدیم اپنا دائرہ کار یہاں تک رکھتی، اور خلافت اسلامیہ ان اُصولوں کو دنیوی رنگ میں ظاہر کر کے انتظام مملکت میں بھی وہی حق رکھتی جو کہ انتظامِ دین میں تھا۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ چند ایک جلیل القدر انبیاء کا مختصر ذکر کر کے ان کی خلافت کے متعلق روشنی ڈالیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو کہ اس میں اور خلافتِ اسلامیہ میں جس کا ذکر ان شاء اللہ العزیز آئندہ نہایت ہی شرح وبسط کے ساتھ آئے گا، کیا فرق ہے اور یہ بھی پتہ چلے کہ خلافتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کا آخری نمونہ ہے، اور یہی خلافت ہے جو کہ نظامِ عالم کے لیے کافی اور جائز ہو سکتی ہے۔

حضرت نوحؑ نو سال تک اپنی گمراہ اور سرکش قوم میں وعظ کہتے رہے لیکن کفر و الحاد اُن کی طبعیتِ ثانیہ بن چکی تھی اس لیے اُن کے زنگ آلود دل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ

انہوں نے اپنی قوم کی طرف خطاب کیا لیکن کہیں بھی اس بات کا پتا نہیں ملتا کہ تمام دنیا کو دعوت دی۔ جب ان کی قوم کی سرکشی اور بد طینی حد اعتدال سے گزر گئی تو نوحؑ کے پاس سوائے اس کے کوئی حربہ نہ تھا کہ انہوں نے اللہ جل شانہ کو پکارا اور اسی سے اس سرکش قوم کے خلاف مدد چاہی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا زبردست طوفان آیا جس نے اس ظالم جابر اور نافرمان قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک دیا اور اس کے ساتھ ہی تمام کائنات عالم کو مصائب اور ابتلا میں جکڑے رکھا۔ حضرت نوحؑ کا صرف یہی مقصد تھا کہ ان کی قوم اللہ تعالیٰ کی توحید کی قائل ہو، اور اس کفر و الحاد سے جس میں وہ پھنسی ہوئی تھی توبہ کر کے اس منعم حقیقی کی طرف اپنی تمام خواہشات اور اغراض سے رجوع کرے جس نے انسان کو تمام مخلوقات پر مشرف کیا۔ اگر ان کی قوم ان باتوں کو مان لیتی تو اس عذاب میں ہرگز ہرگز مبتلا نہ ہوتی بلکہ آرام و آسائش سے اپنی زندگی بسر کرتی، اور نوحؑ اپنے مشن سے فارغ ہو کر عبادتِ الٰہی اور ذکر خداوندی میں مشغول ہوتے۔ آپ کی نو سو سالہ زندگی کے مطالعہ سے کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کا مقصد قوم میں تمدّن قائم کرنا تھا، اور اس کے دنیوی امورات اس طریقہ کے ساتھ ایک نظامِ عمل کے ماتحت لائے جائیں جس سے ان کی دنیوی بہتری مقصود ہو۔ بلکہ وہ تو چاہتے تھے کہ ان کا دین سُدھر جائے، پھر خود بخود ہی وہ اپنے دنیوی کاموں کو انجام دے لیں گے۔ انہوں نے تمام دنیا کو اپنی رسالت کا یقین نہیں دلایا بلکہ ایک خاص قوم کی طرف پیغام خداوندی پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اللہ جل شانہ کے رسول تھے اور ضرور تھے، لیکن ان کی بعثت صرف پیغام خداوندی کے پہنچانے میں مضمر تھی اور کسی قوم کی مملکت قائم کرنے اور اس کے انتظام کے لیے نہیں تھی۔

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت صالحؑ اپنی قوم ثمود میں پکارتے ہیں اور قوم کو گمراہی اور سرکشی سے روکنے کے ساتھ خداوند تعالیٰ کی ایک نشانی دے کر تاکید کرتے ہیں کہ اس کی عزت و توقیر کی جائے، اور جب تک بھی ہو اُس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ لیکن وہ قوم، وہ گمراہ قوم، وہ سرکش قوم، وہ بُت پرست قوم، وہ بدنصیب قوم اُن کے الفاظ کی کچھ بھی نہ پرواہ کر کے خدائی نشان ضائع کرنے کے ساتھ ہی خود ورطۂ ہلاکت میں پھنس جاتی ہے۔ غور کرو، حضرت صالحؑ کا کیا مشن تھا اور وہ کس قسم کی خلافت کے منصبِ جلیلہ پر سرفراز تھے۔ کیا ان کا دائرۂ رسالت کافۃ الناس کے لیے تھا یا کہ وہ بھی صرف اپنی ہی قوم کو اس کفر و الحاد سے باز رکھنے کے لیے مبعوث کئے گئے تھے جس میں وہ مبتلا تھی۔ کیا وہ حکمرانی اور جہانداری کی خواہش اپنے اندر رکھتے تھے تاکہ مخلوقات کو حلقہ اطاعت میں لا کر ان کے دینی اور دنیوی امورات کو سلجھائیں۔ ہرگز نہیں۔ حضرت نوحؑ کی

طرح ان کا خطاب بھی صرف ایک مخصوص گروہِ خلایک کی طرف تھا جس میں وہ خود پیدا ہوئے تھے، اور جو کہ اللہ جل شانہ سے اپنا عہد ترک کر کے اپنے معبودِ حقیقی کے دائرہ اطاعت سے نکل کر اس کی ہستی اور ابدیت کا منکر ہو رہا تھا۔

اس سے بھی آگے چل کر ہم دو جلیل القدر خلفاء لوطؑ اور ہودؑ کو اپنی اپنی قوموں میں نعرہ خداوندی لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اوّل الذکر اور حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ایک ہی تھا اور لوطؑ خلیلؑ کے بھتیجے بھی تھے۔ لوطؑ کو ایک خاص قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا تھا۔ وہ اس میں مدت تک پند و نصائح کے دفتر کھولتے رہے مگر ان کی قوم بھی ایک ایسی بدطینت اور بد خصلت قوم تھی کہ اپنے افعال ذمیمہ سے کسی صورت بھی باز نہیں آتی تھی اور اپنے بُرے فعلوں کے ساتھ ایک ایسے شر کا بیج دنیا میں بُو گئی جو کہ اس وقت تک بھی تمدّن کے لیے زہر ہلاہل کا حکم رکھتا ہے۔ اس قوم کی ہلاکت بھی ایک عجیب طریقہ سے واقع ہوئی جس کا ذکر اس جگہ دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت لوطؑ کی قوم کا فسق و فجور اور بُت پرستی حد سے گزر گئی تو آپؑ بہت رنجیدہ خاطر رہنے لگے، اور جب کبھی بھی حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے قوم کے شرک اور الحاد کا رونا روتے۔ لیکن خلیلؑ ان کو صبر کی تلقین ہی کرتے رہے یہاں تک کہ بہت سا زمانہ گزر گیا۔ آخر کار لوطؑ نے تنگ آ کر اللہ جل شانہ سے دعا کی۔ ''اے خدا! اس فاسق قوم کے بر خلاف میری مدد کر۔'' آپ کی دعا قبول ہوئی اور جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل صلوت اللہ علیہم اجمعین کو خدائے عزّوجل نے ان کی ہلاکت کے لیے روانہ کیا۔ اللہ جل شانہ نے ان کو چلتی دفعہ یہ بھی ارشاد کیا تھا کہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس جا کر ان کو اسحاقؑ کی بشارت دیتے جانا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی کے مطابق وہ تینوں فرشتگان نہایت ہی حُسین اور خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کی پُر شان مہمانداری کی لیکن انہوں نے بعام کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور عرض کیا۔ ''ہم فرشتے ہیں۔ اور حضرت لوطؑ کی طرف اُن کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے ربّ العزت والدّین کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔'' جب حضرت ابراہیمؑ نے سُنا تو بہت مغموم ہوئے اور کہا۔ ''تم قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لیے جا رہے ہو لیکن لوطؑ بھی اُنہیں میں ہیں۔'' فرشتوں نے کہا۔ ''ان لوگوں پر عذاب الٰہی وارد کرنے سے پیشتر ہم ان تمام مومنین کو جو کہ لوطؑ پر ایمان رکھتے ہیں بچا لیں گے، لیکن ان کی عورت قوم کا ساتھ دے گی کیونکہ وہ بھی فاسقوں میں سے ہے۔'' حضرت ابراہیمؑ کو اس پر تسلی

ہوئی اور تینوں فرشتے لوطؑ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ حضرت لوطؑ کے شہر کے قریب پہنچے تو انہوں نے لوطؑ کی لڑکی کو دیکھا اور اگرچہ پہچان لیا کہ وہ آپ کی صاحبزادی ہیں، لیکن انہوں نے ان سے حضرت لوطؑ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ کی لڑکی نے کہا۔ ''تم ان سے مل کر کیا چاہتے ہو؟'' وہ کہنے لگے۔ ''ہم مسافر ہیں اور اُن کی مہمانداری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔'' اس نیک لڑکی نے کہا۔ ''میرے پیچھے چلے آؤ۔'' چنانچہ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ جب وہ گھر میں آئیں تو حضرت لوطؑ سے عرض کی۔ ''کہ آج ایسے خوش رو مہمان آئے ہیں کہ کبھی اس سے پیشتر دیکھنے میں نہیں آئے۔'' جب فرشتے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے لوطؑ کو سلام کیا۔ لیکن جس وقت آپ نے ان کو دیکھا، آپ دل میں غمگین ہوئے کیونکہ آپ کو خوف ہوا کہ جونہی قوم والے ان کو دیکھ پائیں گے ان کے ساتھ بد فعلی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جس سے میری سخت فضیحتی ہو گی۔ چنانچہ آپ نے سوچا کہ ان کو گھر کے اندر پوشیدہ رکھنا چاہیے تاکہ ان کی موجودگی کی کسی کو خبر تک نہ ہو۔ لیکن لوطؑ کی بیوی نے جو کہ آپ کی قوم کے لوگوں سے ملی ہوئی تھی اور ان کی طرح فاجرہ تھی، فرشتوں کی موجودگی کی ان کو خبر کر دی۔ اور وہ جوق جوق حضرت لوطؑ کے گھر کے دروازہ کے آگے جمع ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''کیا تمہیں نہیں کہا تھا کہ کسی کو مہمان نہ کیا کرو۔'' اور ساتھ ہی ان کے متعلق مطالبہ پیش کر دیا۔ لوطؑ نہایت ہی نادم ہو کر ان سے کہنے لگے۔ ''یہ میرے مہمان ہیں۔ تم ان سے اس قسم کی بیہودگی نہ کرو۔ گھر میں میری لڑکیاں موجود ہیں، ان سے نکاح کر لو۔ خدائے عزّوجل سے ڈرو اور مجھ کو رسوا نہ کرو۔'' لیکن انہوں نے ایک نہ مانی اور کہا ۔''اگر تم ان کو بہ رضا و رغبت ہمارے حوالے نہیں کر دو گے تو ہم زبردستی ان کو نکال کر لے جائیں گے۔'' جب اس قسم کا پیغام اس قوم کے دس آدمی لے کر آئے تو حضرت جبرائیل نے ان کی آنکھوں کو اپنے ہاتھ سے مس کیا اور وہ آن کی آن میں نابینا ہو گئے۔ پس جلدی ہی لوٹ کر قوم میں واپس گئے اور کہنے لگے۔ ''لوطؑ نے اپنے گھر میں جادو گر رکھے ہوئے ہیں تاکہ ساری قوم کو اندھا کر دے۔'' چنانچہ پھر انہوں نے چند آدمی بھیج کر کہلوایا ''کہ اگر تم معہ اپنے مہمانوں کے آج گھر سے نہیں چلے جاؤ گے تو کل صبح ہم تم کو اور تمہارے مہمانوں کو اندھا کر دیں گے۔'' جب لوطؑ نے یہ پیغام سُنا تو بہت گھبرائے۔ لیکن فرشتوں نے ان سے کہا۔ ہم خدائے عزّوجل کے رسول ہیں اور آپ کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے آئیں۔ آپ ہرگز خوف نہ کھائیے اور رات کا تھوڑا سا حصہ گزرنے کے بعد ہی اپنے اہل بیت کے ساتھ اس شہر سے نکل جائیے تاکہ صبح سے پہلے آپ اس کی حد سے پار ہو جائیں۔ چنانچہ آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ جن میں آپ کی بیوی شامل نہیں

تھی، وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو ان فرشتوں نے اللہ جل شانہ کے حکم سے تختہ الٹا دیا اور وہ ساری کی ساری سرکش قوم ہلاک ہو گئی۔

ان کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ جن کا عہد ایک شاندار عہد کہا جا سکتا ہے اللہ جل شانہ کی طرف سے کئی ایک نشانیوں کے ساتھ مبعوث ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم الشان خلیفہ کہے جا سکتے ہیں اور انہیں ہی یہ فخر حاصل تھا کہ پاک پروردگار کے حضور حاضر ہو کر ان سے ہم کلام ہوا کرتے تھے اور ضروری احکام سے مشرف ہوتے۔ ان کے فرائض میں ایک ہی بات داخل تھی، جس کے لیے خدائے عزّوجل نے ان کو زمین پر بھیجا تھا، وہ یہ کہ بنی اسرائیل مصر میں فرعون کی حکومت میں نہایت ہی تنگ اور خستہ حالت میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو اس مشن پر روانہ کیا کہ سرکش، نافرمان اور باغی فرعون کو جو کہ اپنی رعونت کے باعث اللہ تعالیٰ کی ہستی سے غافل ہو کر خدائی دعویٰ کئے ہوئے تھا، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے اور مصیبت زدہ قوم بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ عذاب سے رہائی دلوائی جائے۔ حضرت موسیٰؑ اس فرمانِ خداوندی کے ساتھ فرعون کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی باتوں نے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں نے اس پر کچھ اثر نہ کیا اور وہ اُلٹے ان کے درپے ہو گیا۔ مگر اس منعم حقیقی نے ان کو اور قوم بنی اسرائیل کو اس سے بچا لیا اور وہ خود ہلاک ہو کر داخل جہنم ہو گیا۔

اس قسم کی خلافت کا آخری نمونہ ہم حضرت عیسیٰؑ میں دیکھتے ہیں۔ جب قوم یہود میں فسق و فجور حد سے زیادہ گزر گیا تو اللہ جل شانہ نے خلیفۂ اول حضرت آدمؑ کی طرح اس خلیفۂ آخر کو بھی عجیب و غریب طریقہ سے پیدا کیا تاکہ گمراہ قوم اسی طریقہ سے ہی خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں سے فائدہ اُٹھا کر اس کی وحدانیت اور شانِ الوہیت کا اعتراف کرے۔ چنانچہ وہ بلا والد پیدا ہونے کے بعد ایک زبردست رسول اور خلیفۃ اللہ کی شان میں لوگوں کی طرف آئے لیکن ان میں سے بہتیروں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کی جان کے درپے ہو گئے اور آخر کار ان سے وہی سلوک کیا گیا جو ہر ایک کو معلوم ہے۔

ان متذکرہ صدر واقعات اور امثال سے اس بات کا پتہ چل گیا ہو گا کہ سرور کائناتؐ کی بعثت سے قبل خلافت کی کیا صورت تھی اور جو خلفاء ان سے پیشتر ہوئے، ان کے فرائض میں کون سے امورات داخل تھے۔ انہوں نے نظامِ عالم کے لیے کوئی خاص تمدّن وضع نہیں کیا تھا اور نہ ہی جہانداری اور حکمرانی کی طرف ان کا رجوع تھا بلکہ اُن کی خلافت سراسر روحانی ہی تھی، اور دنیوی امورات میں ان کو بالکل سروکار نہیں تھا۔ ان کی کوششیں

صرف اسی بات میں رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے وحدانیت لوگوں کے دلوں میں قائم کر دی جائے، اور بس۔ لیکن باوجود اس بات کے جہاں تک بھی اس عہد قدیم کے واقعات پر نظر دوڑتی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں سرکشی اور بغاوت کا مادہ زوروں پر تھا، اور وہ اس قدر اس کے عادی ہو گئے ہوئے تھے کہ اگر ایک قوم اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ورطہ ہلاکت میں فنا ہو چکی تھی تو دوسری جلدی ہی اس قسم کے سلوک کی مستحق تھی۔ اور اچنبہ کی یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی خلیفہ کبھی بھی کافۃ الناس کے لیے قبل از رسالت مآبؐ نہیں بھیجا تھا بلکہ ہر ایک قوم اور ہر ایک بستی کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ خلیفہ مقرر کیا ہوا تھا جس سے اس کے کام میں سہولت ہوا کرتی تھی، اور وہ نہایت ہی آسانی کے ساتھ اپنے فرائض محدود دائرے کے اندر انجام دے سکتا تھا۔ لیکن ان آسانیوں اور سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بات حاصل نہیں تھی جو کہ ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی خلافت میں کوئی ضرور کمی تھی جس کو اللہ جل شانہ نے سرور کائناتؐ کی بعثت سے پورا کر دیا۔ اور ان کی ذات کے ساتھ ایک اس قسم کی آخری خلافت قائم کی جس کے اُصول اٹل ہیں، اور جو کہ قیامت تک نظام عالم کے لیے نہایت ہی کامیاب اور کافۃ الناس کے لیے مناسب اور جائز ثابت ہو سکتی ہے۔

# تیسری فصل

## آغاز خلافتِ اسلامیہ

### نوعیّت

اللہ جلّ شانہ کے کاموں میں حکمت اور فلسفہ کُوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس وقت وہ کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو اس کے اسباب بھی پہلے سے مہیا کر دیتا ہے۔ ہم نے گذشتہ فصل میں ذکر کیا تھا کہ رسالت مآبؐ کی ذاتِ مقدس کے ساتھ ایسی خلافت کی بنیاد رکھی جانے والی تھی جو کہ نظامِ عالم کے لیے بالکل درست اور جائز تھی، اور جس کا مقصد اولیٰ دنیا میں حریّت آزادی، اور مساوات قائم کرنا تھا۔ اس لیے اس کام کے لیے ضروری تھا کہ اس قسم کی خلافت کا مرکز ایسی جگہ ہو جہاں کے لوگ پہلے سے ہی ایسے اوصاف (حریّت، آزادی وغیرہ) سے متصف ہوں اور ان کی طبعیت کا میلان ان کی طرف آسانی سے جُھکا دیا جا سکے۔

اس خلافت اسلامیہ کے لیے اللہ جل شانہ نے سرزمین عرب کو منتخب کیا۔ عرب کی حالتِ مزبوحی قبل از رسالت مآبؐ ہر ایک فرد و بشر کو معلوم ہے۔ دنیا کی تمام لغویات اور فسق و فجور کا ملجاء اور ماویٰ تھا۔ یہاں کے لوگ لاعلمی اور جہالت میں اس قدر طاق تھے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی ان باتوں میں ان سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ ان کی بُت پرستی کی یہ حالت تھی کہ گھر گھر اور محلّہ محلّہ بُت نظر آتے تھے، اور خدائے واحد کے نام سے انہیں اس قدر بیگانگی تھی کہ اس کی ہستی تک سے ناواقف تھے۔ اُن کو کبھی بھی اس بات کا خیال تک نہیں آیا کرتا تھا کہ ایسی ایک لازوال ذات ہمارے سر پر ہے جس نے ہم کو پیدا کیا، اور اس دنیا میں صرف اسی لیے بھیجا کہ اس کی پرستش اور عبادت میں اپنے اوقات صرف کریں۔ ان کو صرف بدافعالیوں اور سیہ کاریوں سے کام تھا، اور ہر وقت نشہ بادہ الست میں مخمود اور مقہور رہتے تھے۔ بادی النظر میں ان کی ایسی حالت موجودہ زمانہ کا ایک مہذب آدمی دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اُن کی اِصلاح ''کوہ کندن و چاہ بر آوردن'' کی مصداق تھی، اور اس لیے خلافِ اسلامیہ سے اللہ جل شانہ کا جو یہ مقصد تھا کہ تمام دنیا کو ایک ہی دائرہ کے اندر لا کر ایک ہی نظامِ عمل کے تحت قائم کیا جائے اس سرزمین میں اس کا مرکز قائم کرنے سے کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ایسے نظامِ عمل کے قائم کرنے سے یہ لازمی امر تھا کہ تمام عالم کو ایک ہی تمدّن کے اندر لا کر لوگوں میں اخوّت و مساوات کو

قائم کیا جائے، اور ان میں اس قسم کے اصولوں کی بنیاد ڈالی جائے کہ یگانگت پیدا ہو۔ لیکن یہاں تو یہ حالت تھی کہ وہ لوگ مختلف اقوام اور قبیلوں میں منقسم تھے اور ایک دوسرے کے اس قدر دشمن اور جان کے خواہاں کہ سینکڑوں برس تک جنگ و جدل کا بازار گرم رہا کرتا تھا۔ ان کی وحشت اور درندگی کی حالت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان لوگوں کے دل ایک دوسرے سے ایسے متنفر تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر تلوار اور نیزہ کی نوبت آ جایا کرتی تھی۔ پھر بھلا کس طرح ممکن تھا کہ ان میں یگانگت اور اخوت قائم ہو سکے۔ اور وہ اس طرح سے کہ نہ صرف وہ خود آپس میں بھائی بھائی ہو جاتے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنے جیسا خیال کر کے ایک دوسرے کا درد اور دُکھ میں ہاتھ بٹاتے۔

لیکن باوجود ان متذکرہ بالا قبیحات کے ان میں چند ایک ایسے اوصاف کا نشان ملتا تھا جو کہ ان لوگوں کی ذات کے ساتھ ہی خاص تھے، اور دیگر اقوام عالم میں ان کا شمہ بھی نہ پایا جاتا تھا۔ یہی صفات تھیں جن کے ہوتے ہوئے اللہ جل شانہ نے اس آخری خلافت کی بنیاد اُن کے ہاتھ سے رکھی۔ ان صفات میں ان کو اس درجہ مختص کیا جاتا تھا کہ اگر دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے تو بھی وہ باتیں ان کے رگ و ریشہ سے نہیں نکالی جا سکتی تھیں۔ اور چونکہ خلافت کا دار و مدار زیادہ تر انہی باتوں پر تھا جو کہ ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ اس لیے اللہ جل شانہ کا ارادہ اس امر کا مقتضی ہوا کہ اس دنیا میں جس کے نظام کا شیرازہ بکھر گیا ہوا تھا اُنہیں لوگوں کے ہاتھ سے امن قائم کیا جائے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ایسی قوم جس کی بدافعالیوں اور سیہ کاریوں کی فہرست ابھی ابھی لکھی جا چکی ہے، وہ کون سی صفات حمیدہ اپنے اندر رکھتی ہو گی جو کہ تمام دیگر اقوام سے اس کو ممتاز کرتی تھیں۔

ان میں فصاحتِ کلام، شجاعت، آزادی، فیاضی اور غیرت ایسی صفات تھیں جو کہ ان کو دوسروں پر شرف دیتی تھیں۔ ان کی زبان میں فصاحت اس درجہ کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ دیگر اقوامِ عالم کو انہوں نے ''عجم'' کا لقب دیا ہوا تھا۔ شجاعت کا وہ حال تھا کہ پہاڑ، دریا اور ریگستان ان کو قوی سے قوی دشمن کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے سے بھی نہیں روک سکتے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک فرد ہر وقت دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کو کبھی بھی اس بات کا خیال نہیں ہوا کرتا تھا کہ میرا مدّ مقابل ایسا قوی ہیکل اور جنگجو واقع ہوا ہے کہ آن کی آن میں میرا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا بلکہ اس کا یہی گمان ہوا کرتا تھا کہ دنیا میں میرے جیسا کوئی بہادر ہے ہی نہیں اور شجاعت صرف میرے لیے ہی پیدا کی گئی ہے۔ ان لوگوں میں آزادی ہی ایک ایسی چیز تھی جس پر وہ بجا طور سے فخر کر سکتے تھے۔ وہ کبھی بھی کسی حالت میں کسی ایک کے آگے اپنا سر اطاعت خم

نہیں کرتے تھے۔(اور اب تک بھی نہیں کرتے ہیں)ان کی پرورش وتربیت اور نشوونما اس قسم کی آب وہوا میں ہوئی ہوئی تھی کہ ان کے دلوں میں یہی اُمنگ جوش زن رہی کہ ستاروں والے آسمان کے نیچے ہم پر کوئی بھی حکومت کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا، اور ہم اس دنیا میں صرف اس لیے آئے ہیں کہ آزاد زندگی بسر کریں۔ فیاضی کیا تھی، ان کے گھر کی لونڈی تھی۔اس صفت کا ایک بدوی عرب اس قدر دلداہ تھا کہ جب کبھی بھی اس کو اس کے اظہار کا موقع ملتا تو اپنی جان مال اور اولاد تک سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ فیاضی کے برتنے کے وقت دنیا کی کوئی خواہش اور حرص اس کے راستہ میں حائل نہیں رہتی تھی۔وہ ایک لٹیرا بھی تھا، مگر کوئی مہمان اس کے خیمے کے سامنے آگیا تو اس کے لیے گویا عید کا چاند ہوگیا۔وہ اس کا ہاتھ پکڑ اپنے خیمہ کے اندر لے جاتا اور اس کی اتنی خدمت کرتا کہ خود تو غلاموں کی طرح کمربستہ رہتا، اور اس کی بیوی اور لڑکیاں اس کی لونڈیاں ہوتیں۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کرتا تھا کہ ایک مہمان کی خاطر ان بدوی قبائل میں خونریزی کی نوبت پہنچ جایا کرتی تھی اور صرف اسی کی خاطر کٹ کٹ کر مر جاتے۔ غیرت ان میں اس درجہ تھی کہ اپنی ڈاڑھی اور عورت کی بے حرمتی اُن کو انتقام لینے سے کسی صورت میں روک نہیں سکتی تھی۔ان کی گھٹی میں اس صفت کو اس درجہ دخل تھا کہ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی غیرت کو آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔

باوجود ان عاداتِ ذمیمہ کے اس قوم میں یہ صفات حمیدہ پائی جاتی تھیں جو کہ اب دنیا کی قسمت کی مالک ہونے والی تھی، اور جس کے ہاتھوں اللہ جل شانہ آخری خلافت کی بنیاد رکھنے والا تھا۔ کیا آپ خیال نہیں فرما سکتے کہ اگر کسی قوم میں اس قسم کے اوصاف پائے جائیں تو وہ ترقی کے معراج پر پہنچنے سے رُک سکتی ہے۔ ان عربوں میں ان کی بد عادات کے ساتھ ساتھ فصاحت، شجاعت، آزادی، فیاضی اور غیرت بدرجہ اولیٰ پائی جاتی تھیں۔ لیکن افسوس وہ ان کا غلط استعمال کرتے تھے۔ان کو ایک ایسے رہبر کی ضرورت تھی جو ان کو صحیح راستہ پر چلا سکتا۔ان کی قسمت میں تمام عالم پر حکومت کرنا تھا اور یہی ایسی صفات تھیں جن کے ہوتے ہوئے وہ دنیا پر حکومت کرنے اور آزادی، حریت اور مساوات کا ڈنکا بجوانے کے اہل ہو سکتے تھے۔

کسی قوم کو اپنے اصول منوانے کے لیے فصاحتِ کلام کی ضرورت ہے۔ سو ان میں موجود دشمن سے اپنی جان اور آزادی کی حفاظت کے لیے شجاعت چاہیے تھیں سو وہ ان کی خلقت میں دویعت کی ہوئی تھی۔اپنے آپ کو دوسروں کے حلقۂ غلامی سے بچانے کے لیے اصولِ آزادی کی ضرورت تھی، سو وہ تو ازل سے ہی ان کے اندر پایا جاتا تھا، اور ان کی فطرت میں داخل تھا کہ کسی کے ماتحت رہنا ہی نہیں۔ دوسروں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے

ضروری ہے کہ اپنے میں فیاضی کے جوہر پائے جائیں، سو یہ بات تو ان کے طرز معاشرت میں روزانہ دیکھنے میں آیا کرتی تھی۔ غیرت کسی قوم کی ترقی کا ضروری اور لازمی زینہ ہے کیونکہ غیرت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کی آزادی، حریّت، جوہر شجاعت اور مادۂ کامرانی اور حکمرانی قائم رہ سکتے ہیں۔ غرضیکہ کون کونسی باتیں تھیں جو کہ ترقی ملت کے لیے ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اگر کمی تھی تو یہ کہ ان کو ایک عظیم الشان ہستی کام کرنے کے قابل بنادے۔

اب وقت آگیا کہ اللہ جل شانہ رسالت مآبؐ کو سرزمین عرب میں مبعوث فرما کر اس آخری خلافت کی بنیاد دنیا میں ڈالے، اور آنحضرتؐ کے ذریعہ سے ایک ایسا نظامِ عمل قائم کیا جائے جو کہ یوم قیامت تک اقوام دنیا کے لیے نہایت ہی مناسب ثابت ہونے والا تھا، اور جس کے بغیر کسی صورت بھی امن قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپ حضرت مسیحؑ سے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال بعد رحمۃ للعالمین کے لقب کے ساتھ اس خاکستانِ عرب میں رونما ہوئے جو کہ اب آخری خلافت کا مرکز اور دنیا کے مسلمانوں کا مرجع بننے والا تھا۔

## توحید

کسی کام کے شروع کرنے سے پیشتر اس کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد ایک نصب العین قائم کیا جاتا ہے تاکہ اس کے انجام دینے میں آسانی واقع ہو۔ آنحضرتؐ اس سرزمین میں پیدا ہو کر بچپن سے ہی کچھ ایسے آثار ظاہر کرنے لگے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ آپ عنقریب ایک حیرت انگیز انقلاب برپا کرنے والے ہیں۔ آپ میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی تھیں جو کہ عربوں میں موجود تھیں۔ لیکن ان کے افعالِ ذمیمہ سے آپؐ بالکل متنفر رہا کرتے تھے۔ جب آپؐ کی عمر مبارک چالیس (40) سال کی ہوئی تو اللہ جل شانہ نے آپؐ کو وحی کی وساطت سے ارشاد فرمایا کہ اپنی بھولی بھٹکی قوم کو خدائے مطلق، مالک جن وانس کے ماننے کی دعوت دیجیے اور ان کو تلقین کیجیے کہ اس دنیا کی ہستی اور نیستی اس کے ہی قبضۂ قدرت میں ہے، اور وہی سیاہ سفید کا مالک ہے۔ بھلا سب سے پہلے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا؟ کیوں کچھ اور ارشاد نہ ہوا؟ کیوں نہ ان کی طبائع اس طرف لگائی گئیں جس طرف ان کا جھکاؤ آسانی کے ساتھ عمل میں پایا جاسکتا تھا؟ یہ کس قسم کا حکم تھا، انہوں نے تو کبھی یہ نام سُنا بھی نہ تھا۔ اس ارشاد سے صرف یہی مقصد تھا کہ ان میں ایک نصب العین قائم ہو جائے۔ اور جب ان کا ایمان اس بات پر راسخ ہو جائے گا کہ اللہ جل شانہ کل کائنات عالم کا مالک ہے، اور اسی کے ہاتھ میں انس و جن کی جان ہے، اور وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے جسے چاہتا ہے، عزّت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے، تو وہ بہ رضاؤ

رغبت اپنے تمام کاموں کو اسی کی طرف رجوع کریں گے ،اور اس کے عشق میں پہاڑوں، سمندروں، جنگلوں، ریگستانوں اور چٹانوں تک کی پرواہ نہیں کریں گے۔یہی ایک بات جوان کو خواہشات نفسانی سے باز رکھ سکتی تھی۔اس کے بغیر ان کی حالت ایسی تھی جیسی کہ ایک شتر بے مہار کی ہوا کرتی ہے کہ وہ کوئی راہ نہیں پاتا، اور اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے۔

جب یہ ارشادِ باری ہوا تو پھر کیا تھا، حضورؐ فوراً حکم خداوندی کے بجالانے کے لیے کمربستہ ہو گئے اور اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ آؤ ہدایت کی طرف اور کفر اور الحاد اور فسق وفجور کو ترک کر دو، اور صرف اسی ایک ذات پر اپنی امیدوں کے حصول کا بھروسہ رکھو۔جب انہوں نے یہ عجیب و غریب بات سُنی تو بھڑک اُٹھے۔ لیکن ان میں سے اکثر دانا اور سمجھ دار آپ پر ایمان بھی لے آئے، لیکن ایک کثیر تعداد آپؐ کے مخالف ہو کر آپؐ کی جان کے درپے ہو گئی۔جو ان میں دولت مند تھے انہوں نے آپؐ کو لالچ دلایا کہ اس قسم کی روش چھوڑ دیں۔جو زیادہ دلیر اور بہادر تھے انہوں نے آپؐ کو ڈرایا، دھمکایا کہ اس سے باز آجائیں۔ مگر اس توحید الہٰی کی اشاعت کے راستے میں ان کو کوئی طاقت بھی نہ روک سکی۔وہ سختیاں جھیلتے، مشقتیں اُٹھاتے، ظلم برداشت کرتے، جور کا شکار ہوتے لیکن اس دُھن کو نہ چھوڑتے۔یہ سب کچھ کس لیے ؟اس لیے کہ انہوں نے دکھلانا تھا کہ خلافت کے سب سے اہم امورات میں سے یہ امر از بس ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید کے پھیلانے میں جان مال اور عزّت تک سے دریغ نہ کیا جائے۔یہ ایک ایسا کام تھا جو کہ خلافت کا اصل الاصول تھا کیونکہ اس کے بغیر اس کی بنیاد مستحکم اور مضبوط نہیں ہو سکتی تھی۔اس کے تمام دیگر امورات کا دار و مدار صرف اسی ایک بات ''توحید، توحید، توحید'' پر تھا۔

## ہجرت

جب آپؐ کی بے انصاف قوم کا جور و ستم حد سے گزر گیا تو آپؐ کو ارشاد ہوا کہ مع اپنے رفقاء کے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ کی طرف تشریف لے جائیں، اور اس خلافت کی بنیادوں کو جس کے لیے آپؐ کا ظہور اس عالمِ سفلی میں ہوا تھا، مستحکم کرنے میں دل جمعی کے ساتھ کوشاں ہوں۔اللہ ! اللہ ! ! اس ہجرت میں کیا ہی حکمت پائی جاتی ہے۔کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کفّار سے خوفزدہ ہو کر مدینہ منورہ کی طرف نقل مکان کر گئے ؟کیا آپ کا یہ گمان ہے کہ چونکہ آپؐ کے وطن والے آپؐ سے بد سلوکی کرتے تھے اس لیے آپؐ ان کی بد سلوکی سے تنگ ہو کر اس طرف راہی ہوئے ؟یہ بات ہر گز نہیں کیونکہ اگر اللہ جل شانہ چاہتے تو آپؐ

کے دشمنوں کو آن کی آن میں برباد کر دیتا۔ پھر آخر یہ کیا بات تھی، تھوڑے سے غور کی ضرورت ہے عقدہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہجرت میں اللہ تعالیٰ کی دو غرضیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ آیندہ نسلوں کے لیے مثال قائم کر دی جائے کہ جس جگہ فرائض دینی کے انجام دینے میں مسلمانوں کے راستہ میں روڑے اٹکائے جائیں تو وہاں سے بلا کسی قسم کی آمادگی فساد کے نقل مکان کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اس بات کو اپنے حبیب سرور کائناتؐ کی عملی مثال سے ثابت کر کے دکھایا۔ دوسری غرض جو کہ نہایت ہی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ دکھائی دیتی ہے کہ چند ایک ہم مذہب اپنے وطن میں رہتے ہیں، مگر کفار کا غلبہ ہے۔ وہ دین کے فرائض کی ادائیگی میں ان کے مزاحم ہوتے ہیں چونکہ وہ لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے وطن میں ہیں، اور ایک دُوسرے سے الگ الگ بکھرے ہوئے بسر اوقات کرتے ہیں اس لیے ان کی خلافت ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتی، اور کفار کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہیں گے۔ اس کا علاج اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ وہ سب کے سب کسی دوسری جگہ چلے جائیں، اور چونکہ وہ اپنے وطن سے دُور ہوں گے اور غربت کا عالم ہوگا، وہ خواہ مخواہ ایک دوسرے سے قریب ہو کر یگانگت اور برادرانہ تعلقات بڑھائیں گے، اور اُن میں اخوت استحکام پکڑے لے گی۔ یہ ضروری ہے کہ وطن کی یاد اُن کو ستائے گی، اور وہ واپس جانے کے لیے سرگرمی سے کوشاں ہوں گے، اور اپنے دشمنوں پر غالب آنے کی تدابیر نکالیں گے، آخر کار اسی اُمنگ میں اپنی مجموعی طاقتوں سے اپنا مدعا حاصل کر لیں گے۔

یہ ہجرت کیا تھی، استحکامِ خلافت کا ایک ایسا آلہ تھا جو کہ کبھی بھی ناکارہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کی فضلیت کیوں بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کو عمل میں لانے سے دین الٰہی کی ترقی ہوتی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد ہی اسلام کو وہ ترقی حاصل ہوئی جو کہ بعد کے زمانہ میں دیکھنے میں آئی تھی۔ وہی مکّہ جس نے آنحضرتؐ کو وطن میں ایک گھڑی آرام نہ لینے دیا اب آپؐ کے قدموں پر نثار ہو کر آپؐ کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

## جہاد

جب ارشاد باری کے بموجب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں کے بہت سے قبائل حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، تو آپؐ نے اپنے قول اور فعل سے لوگوں کو یقین دلوایا کہ ہر ایک مسلم کا فرض ہے کہ توحید الٰہی کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، اور چونکہ آپؐ کی بعثت کا مقصد ہی دنیا میں امن قائم کرنا تھا اس لیے امن اسی صُورت میں قائم رہ سکتا تھا کہ تمام دنیا توحید کی ایک ہی زنجیر میں منسلک ہو۔ اس مدعا کے حصول کے لیے

چند ایک باتوں کی ضرورت تھی۔ اول وعظ و نصیحت، دُوسرے مفتوحہ اقوام سے خلط ملط، اور یہ دونوں باتیں اس طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس قوم میں خلافت الہیہ کے اصولوں کو رواج دینا ہوتا ہے اس کے سامنے نہایت ہی آزادی اور مصالحت کے ساتھ وہ اصول پیش کئے جاتے ہیں، اور ان سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ ان کو قبول کرے۔ اگر وہ ان سے انکار کرے تو پھر کہا جاتا ہے کہ تم اپنے ہی اصولوں پر قائم رہو (جو کہ اصل میں باطل ہیں) لیکن اطاعت قبول کر کے ہمارے قبضۂ اقتدار کے اندر آجاؤ جس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ توحید الہٰی کے علم برداروں کی صحبتِ فیض اور طرز عمل سے خود بخود وہ گرویدہ ہو کر اپنے ناقص اصولوں کو ترک کر کے خلافت الہیہ کے امان میں آجائے گی۔ یہ سب سے اہم طریقے اشاعتِ اسلام کے ہیں اور اگر بفرضِ محال ان دونوں باتوں کے ماننے سے وہ انکار کرتی ہے تو پھر اس کو بزور تلوار مطیع کیا جائے۔ لیکن اس کی اطاعت کے بعد اس پر مذہبی یا سیاسی طور سے کسی قسم کا جبر روا نہیں رکھا جاتا۔ یہی آخری طریقہ ہے جس کو جہاد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کو خلافت کے دشمنوں کے خلاف کام میں لایا جاتا تھا یا ان معنوں میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اکثر مخالفین اسلام اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، اور اس کے جواب میں مسلمان بھی طرح طرح کی وجوہات پیش کر کے ان کے اعتراضات ردّ کرتے ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا، لیکن اس طرح جس طرح بیان کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے عرب کا بہت سا حصّہ بزور شمشیر تسخیر کیا، مگر کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے زبردستی سے کسی کو مسلمان کیا ہو۔ ان کا مشن تو یہی تھا کہ خدائے عزّوجل کی آخری خلافت قائم کر کے دنیا میں امن کی بنیاد ڈالی جائے، اور چونکہ یہی خلافت آخری خلافت تھی جو کہ قیامت تک رہنے والی تھی، اور ان شاءاللہ العزیز رہے گی، اس لیے اس کے استحکام کے لیے خود بدولت انہوں نے اپنے ذاتی طرز عمل سے دکھلانا چاہا کہ اس کے علم برداروں کا حضورؐ کے عالمِ بالا کی طرف سدھارنے کے بعد کیا طرزِ عمل ہو گا۔

## اخوت و مساوات

خلافت اسلامیہ کیا ہے؟ حکومت جمہوریہ ہے۔ یہ دنیا کے ہر ایک مسلمان کو بادشاہ ہو، امیر ہو، وزیر ہو یا فقیر، درویش ہو یا رئیس خواہ کسی طبقہ کا ہو، ایک ہی حقوق دیتی ہے، اور ان سب کو ایک ہی مسلک میں منسلک کرتی ہے۔ اس بات کی اگر مثال چاہو تو آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے زریں عہدوں میں ہزاروں کی تعداد میں مل جائیں گی۔ خدائے عزّوجل کا ارشاد ہے۔ ''سب مومن بھائی بھائی ہیں۔'' اس زریّن مقولہ میں کوئی بات ہی

نہیں چھوڑی گئی اور یہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ اُس زمانہ میں اس کی عملی مثالیں بھی پائی گئیں۔ بلالؓ کون تھے؟ ایک ادنیٰ درجہ کے حبشی غلام۔ ان کی قریش کے مقابلہ میں کیا ہستی تھی؟ وہ قوم قریش میں شادی کے لیے پکارتے ہیں تو بڑے بڑے ذی عزّت اور صاحب وقار خاندان ان کو اپنی دختریں پیش کرتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کون تھے؟ ایک فارسی غلام تھے۔ آنحضرتؐ نے اُن کو آزاد کروایا تھا۔ آپ جانتے ہیں ان کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔ جنگ خندق میں جب سب صحابہؓ خندق کے کھودنے میں مشغول تھے اور نہایت ہی مستعدی اور بُردباری کے ساتھ کام کر رہے تھے تو ان میں سلمانؓ بھی شامل تھے۔ لیکن انہوں نے ایسی ہمّت اور دلیری کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیا کہ صحابہؓ عش عش کرنے لگے۔ لیکن مہاجرین اور انصار کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہو گیا۔ مہاجرین کہتے کہ سلمانؓ مہاجر ہیں اور انصار کہتے کہ نہیں وہ انصاری ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ معاملہ آنحضرتؐ کی خدمت مقدس میں پیش ہوا۔ آپؐ نے مساوات کا کیسا زریّں اصول اپنے فیصلہ میں قائم کیا۔ آج اگر ایسی مثال چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو کسی قوم کی گذشتہ اور موجودہ روایات میں نہیں پاؤ گے۔ آپؐ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا ''سلمان میرے اہلبیت سے ہیں۔'' آپ سنتے ہیں۔ سرور کائنات، سلطان البحر والبرؐ، حبیب خداؐ ایک غلام کو اپنے اہلبیت میں سے ہونے کا درجہ عنایت کرتے ہیں۔

اخوت کی مثال سنئے۔ جب ہجرت کے بعد بہت سے مسلمان مدینہ منورہ چلے گئے تو بالکل بے سروسامان تھے۔ سوائے خدا تعالیٰ کے نام کے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس حالت میں وہ کیا کرتے۔ مدینہ والوں نے اُن سے وہ سلوک کیا جو کہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔ انہوں نے ایک ایک کو بھائی بنا کر اپنے گھر رکھا۔ اور صرف یہی نہیں کیا کہ ان کے لیے معمولی روزانہ ضروریات مہیا کیں بلکہ اگر کسی کے پاس دو مکان تھے تو ایک اپنے دینی بھائی کو دے دیا۔ اگر دو چارپائیاں تھیں تو دُوسری اُسے دے دی۔ غرضیکہ اپنا اثاث البیت نصف اپنے بھائی کو دے دیا۔ اور اسی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ کہا جاتا ہے کہ اگر دو عورتیں عقد میں تھیں تو ایک کو طلاق دے کر اس کو اپنے بھائی سے بیاہ دیا۔

کیا اخوت کی اس سے عمدہ مثال مل سکتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ نہایت ہی قلیل عرصہ میں آنحضرتؐ کی تعلیم نے ان کے دلوں کے اندر گھر بنا لیا تھا۔ آپؐ دنیا میں بچھڑوں کو ملانے، گمراہوں کو راہ راست پر چلانے اور وہ لوگ جو ایک دوسرے کی گردنوں پر چُھریاں چلاتے تھے، ان کے درمیان اتحاد قائم کرانے آئے تھے۔

اللہ جل شانہ قرآن مجید میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ''تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ہم نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی۔ پھر تم ہماری (خدا کی) مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔''

## اصُول تمدّن

اس آخری خلافت کے بانی آنحضرتؐ ہوئے ہیں۔ لیکن یہ خیال ہر گز نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے لیے جو قوانین وضع کئے گئے تھے وہ اُن کے اپنے ہی بنائے ہوئے تھے۔ یہ قوانین ایک ایسے مجموعہ قوانین میں درج کئے ہوئے ہیں جس کو عرف عام میں قرآن مجید کہتے ہیں۔ ان قوانین کو ایسا آسانی کا جامہ پہنایا گیا ہے کہ ہر ایک شخص ان سے بلا دقت استفادہ اُٹھا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ''ہم نے اس قرآن کو مومنوں کی ہدایت کے لیے اتارا۔'' یہ ہدایت کیا ہے؟ دینی اور دنیوی۔ اس خلافت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ لوگوں کے دینی اور دنیوی امورات کی کفیل ہو۔ اگر آنحضرتؐ ایک طرف واعظ کی حیثیت میں بر سرِ منبر نصیحت فرما رہے ہیں تو دوسری طرف ایک سپہ سالارِ اعظم کی طرح میدانِ جنگ میں معرکہ آرائی میں مشغول ہیں۔ اگر ایک جگہ نماز، روزہ اور حج کے ارکان بیان فرما رہے ہیں تو دوسری جگہ شراب، جُوا اور زنا کے مقدمات فیصل کر کے ملزمین کو سزائیں دے رہے ہیں۔ ان کی خلافت وہ خلافت نہیں تھی جو کہ ہم آپؐ کے زمانہ سے قبل دیکھتے ہیں، بلکہ ان کی خلافت میں توحید الٰہی کے پھیلانے کے ساتھ اصول تمدّن رائج کرنے تھے جو کہ آیندہ نظام عمل کے لیے از بس ضروری تھے۔

قرآن مجید کے احکام فرض ہیں کیونکہ وہ ارشادِ خداوندی ہے۔ اللہ جل شانہ نے قرآن مجید اس لیے ارسال نہیں کیا کہ اس پر عمل نہ کیا جائے بلکہ اس لیے کہ ہر ایک مسلمان کما حقہ اس کے احکام کی پیروی کرے، اور اگر کوئی ایک اس کے کسی ایک فرض کی ادائیگی میں غفلت کرتا ہے تو گویا اس نے نظامِ عمل کی نافرمانی کی، اور نظامِ عالم میں رخنہ انداز ہوا۔ تو لازمی امر ہے کہ اس کو اس خلافت ورزی کی سزا دی جائے۔ آخر سزا کون دے گا، وہی جو کہ خلیفۂ وقت ہو گا، اور کون؟ ہم حیران ہیں کہ فی زماناً اکثر جاہ پرست لوگ غلط تاویلیں اس بات میں کرتے ہیں کہ مذہب اور سیاست دو جُدا چیزیں ہیں لیکن اس کی کوئی وجوہات پیش نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن مجید سے، آنحضرتؐ کے اقوال سے، صحابہ کبارؓ کے طرزِ عمل سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے، دیگر مذاہب کی بابت ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، (کم از کم) کہ اسلام مذہب اور سیاست کو الگ الگ جگہ نہیں دیتا، اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو برباد بھی اسی وقت کیا جبکہ ان کو جُدا جُدا سمجھنے لگے۔

ارشاد ہوتا ہے، نماز پڑھو تاکہ تمام فواحشات اور منکرات سے بچتے رہو، اور وہ بھی باجماعت تاکہ اپنے بھائیوں سے ہر وقت ملاقات تازہ رہے اور اخوت اور محبت بڑھے۔ پھر کہا روزے رکھو، تاکہ تزکیہ نفس ہو اور لغویات سے پہلو تہی کرنے کی عادت ہو، اور سوسائٹی کے لیے کار آمد ہو۔ پھر ارشاد کیا، زکواۃ دو تاکہ تمہارے غریب، مفلس اور نادار بھائی افلاس کے قعر مزلت میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے فنانہ ہو جائیں بلکہ تمہاری فیاضی اور ہمت سے اس دنیا میں ترقی کرنے کے قابل ہوں، اور تمہارے اس طرزِ عمل سے بڑے بڑے قومی کام سرانجام ہوں۔ پھر فرمایا حج ادا کرو تاکہ ایک تو خدائے عزوجل کی خوشنودی میں تمہاری نیت بخیر ہو، اور دوسرے تمام دنیا کے مسلمان ایک دُوسرے کے ساتھ ملاقات کر کے تبادلۂ خیالات کریں اور ملتِ اسلامیہ کی بہتری کی تدابیر اپنے مشترکہ مشوروں سے نکالیں۔ پھر حکم ہوا (حدیث ہے) تلوار زنی، نیزہ بازی، دیگر اسی قسم کی بہادرانہ ورزشوں کی مشق کرتے رہو تاکہ خدا تعالیٰ کی خدمات بجالانے میں ہر وقت مستعد رہو۔ پھر ارشاد ہوا اپنے مسلمان بھائی کے خلاف کسی صورت بھی تلوار نہ اُٹھاؤ تاکہ تم ایک دوسرے کے گلے کاٹ کر خود فنانہ ہو جاؤ۔ پھر کہا یتیموں کا مال مت کھاؤ تاکہ ظلم و ستم کی تم میں ترقی ہو کر انصاف کا خون نہ ہو۔ پھر حکم ہوا زنا نہ کرو تاکہ تمدّن خراب نہ ہو جائے، اور سیہ کاریوں کے سبب تمہارے قویٰ جو کہ اللہ جل شانہ کی خدمت کے لیے کام میں لانے چاہئیں ضائع نہ ہوں، اور اگر تم میں سے کوئی بھی ایسا کرے تو اس کو سزا دو (یہ سزا خلیفہ وقت دے گا) ۔ پھر ارشاد ہوا، شراب نہ پیو تاکہ بدمست ہو کر اپنے اور بیگانہ میں فرق نہ معلوم کر کے وہ کچھ کر گزرو جو کہ اصولِ معاشرت کے خلاف ہے۔ پھر کہا، جُوا مت کھیلو تاکہ تم میں سے کسی ایک پر ظلم نہ ہو اور آن کی آن میں فقیر ہو جائے۔ پھر ارشاد ہوا، مسجد الحرام کے قریب کفّار کو نہ آنے دو کیونکہ وہ نجس ہیں (ان کے اندر نورِ ایمان نہیں)۔ اس لیے اس مقدس زمین کو اپنی ناپاک موجودگی سے نجس نہ کر دیں۔ پھر حکم ہوا، اپنی عورتوں کو پردہ میں رکھو تاکہ بدافعالیاں نہ بڑھنے پائیں۔ پھر حکم ہوا، تمہاری وراثت کے اصول اس قسم کے ہونے چاہئیں کہ حقدار کو اس کا پورا پورا حق پہنچے۔ پھر ارشاد ہوا کہ اگر تم میں سے کوئی کسی دوسرے کو قتل کرے تو اس کو بھی قتل کر دو اور اگر مقتول کے وارث دیت لے کر اپنے دعوے سے باز آجائیں تو اس کی گردن نہ مارو۔

غرضیکہ اسی طرح کے ہزاروں اصول معاشرت کے قائم کئے گئے جن کے اعادہ کے لیے ایک دفتر چاہئے۔ ہم نے بمصداق ''مشتے نمونہ از خروارے'' نہایت ہی مختصراً چند ایک کا ذکر کیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو کہ خلیفہ کی ذات میں دین و دنیا کو کس طرح لازم و ملزوم کیا گیا ہے۔ آخر ان اصولوں کو پہلو بہ پہلو کیوں رکھا گیا۔ کیا

اس طرح نہیں ہو سکتا تھا کہ دین کے کام علیحدہ اور دنیا کے کام الگ طور سے انجام پائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو نہایت ہی مشکل واقع ہوتی۔ دنیا کو دین کے ماتحت اسی لیے رکھا گیا کہ انسانی تمدن میں کسی قسم کی خرابی نہ ہو۔ اور اگر خلیفہ لوگوں کے دینی کاموں کے ساتھ اور دنیوی کاموں کے ساتھ دنیوی امورات کا کفیل نہ ہوتا تو وہ نظام جو کہ قائم کیا جانے والا تھا کسی صورت میں انجام نہ پاتا۔

آنحضرتؐ نے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایک ایسی رَو جاری کر دی تھی کہ وہ ہر وقت اسی خیال میں مست رہتے کہ اللہ جل شانہ کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہوں۔ کوئی لمحہ بھی اس کی خوشنودی حاصل کئے بغیر نہ گزرنے پائے۔ کیا سفر اور کیا حضر میں اس کی یاد ان کے دلوں میں تازہ رہتی، اور کبھی بھی وہ اس منعم حقیقی کو نہ بھلاتے جس کے سامنے انہوں نے ایک نہ ایک دن جواب دہی کے لیے حاضر ہونا تھا۔ اللہ جل شانہ کا خوف ان کے دلوں پر اس قدر طاری تھا کہ ان کے جلیل القدر لوگ تک بھی باوجود اس بات کے کہ اُن کے زہد و اتقا میں کسی قسم کا شک نہیں تھا اور اُن کی زندگی میں آنحضرتؐ کی وساطت سے ان کو بہشت کی بشارت مل چکی تھی، ہر وقت ہراساں رہتے تھے کہ خدائے عزّوجل کے سامنے ان کا کیا حشر ہوگا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فاروق اعظم خلیفۂ ثانی نے ابو موسیٰ اشعری (جو کہ ایک جلیل القدر صحابی تھے) سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیوں ابو موسیٰ تم اس پر راضی ہو کہ ہم لوگ جو اسلام لائے، اور ہجرت اختیار کی، اور رسول اللہؐ کی خدمت میں ہر جگہ موجود رہے، ان تمام باتوں کا صلہ ہم کو یہ ملے کہ برابر سرابر چھوٹ جائیں۔ یعنی ہم کو نہ ثواب ملے، نہ عذاب۔'' ابو موسیٰ نے کہا۔ ''نہیں میں تو ہرگز راضی نہیں۔ ہم نے بہت سی نیکیاں کی ہیں اور ہم کو بہت کچھ امید ہے۔'' حضرت عمرؓ نے کہا، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں عمرؓ کی جان ہے، میں تو صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ ہم بے مواخذہ چھوٹ جائیں۔

لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہئیے کہ انہوں نے اس قسم کی کبھی بھی تلقین نہیں کی تھی کہ اس خالق و مالک الملک کی یاد میں اپنے دینی کاموں کو ترک کر دیں۔ کیونکہ دنیا سے غفلت کرنا بھی خدائے عزوجل کی نافرمانی میں داخل ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس عالم کو پیدا کیا اور اس کے نظام کے لیے انسان کو ہی منتخب کیا۔ پھر بھلا کس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان اس سے غافل ہو اور خدائے عزوجلّ کی خوشنودی کا امیدوار رہے۔ آنحضرتؐ نے رہبانیت کو دنیا سے مٹا دیا اور دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی آراستگی کا بھی حکم دیا۔ اگر آپؐ کا مقصد صرف فقیر اور مست درویش بنانے کا ہی تھا تو پھر کیا ضرورت تھی کہ معاشرت کے ایسے ایسے اصول باندھتے جو کہ لوگوں کو دنیاوی

مخمصوں میں پھنسائے۔ اگر یہی مقصد تھا کہ لوگ دنیا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں تو آپؐ نے خلافت کو اس قدر وسعت کیوں دی، اور اس کے لیے ایسے ایسے زریّں قوانین کیوں قرار دیئے جو کہ دنیا کے دارو گیر میں مبتلا کرنے والے تھے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپؐ ہمیشہ سادی زندگی کے لیے فرماتے رہے اور آپ کا یہی ارشاد رہا کہ اللہ جل شانہ کی خوشنودی کے مقابلہ میں دنیا کو ہیچ جانو۔ اور اگر اس کو درست کرتے ہو تو اس میں بھی اسی خالق الملک کی رضا جوئی مقصود ہو۔ تمہاری زندگی اس قسم کی ہو کہ اس میں خلق خدا کا بھلا ہو، انسان کی خدمت ہو، مسلمانوں کی بہتری ہو۔ اگر تم دنیا کو اس لیے چاہتے ہو کہ عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر ہو، ہر ایک قسم کے آرام و آسایش ہوں، اور بنی نوع انسان خواہ کسی حالت میں ہوں اپنا وقت آسودگی سے گزرے، تو ایسی زندگی درندوں سے بھی بدتر ہے۔

انہوں نے قرار دیا کہ خلیفہ رعیت کا خدمت گزار رہے۔ وہ لوگوں کا نگہبان اور ان کا خزانچی ہے۔ اس کو کوئی حق حاصل نہیں کہ بے جا طور سے لوگوں کا روپیہ اپنے مصرف میں لا کر ضائع کرے اور ان کے کام اسی طرح پڑے رہیں۔ بلکہ اس کے لیے تو یہ بات لازم ہے کہ رعیت کے حالات سے واقف ہو اور ہر وقت اُن کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو رفع کرنے میں کوشاں رہے۔

## جمہوریت

سب سے زیادہ قابل قدر بات جو خلافت اسلامیہ میں پائی جاتی ہے وہ اس کی جمہوریت کی شان ہے۔ آنحضرتؐ جب کبھی کسی مہم پر تشریف لے جاتے یا کوئی اہم کام آپؐ نے انجام دینا ہوتا تو آپؐ صحابہؓ کو جمع فرماتے، اور ان سے اس معاملہ میں مشورہ لیتے۔ یہ بالکل درست ہے کہ آپؐ خود بدولت بلا مشورہ کسی کام کو شروع کرتے تو اس میں آپؐ کے صحابہؓ کو کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو سکتا تھا، اور وہ کام بھی صحیح طور سے انجام پاتا کیونکہ آپؐ کی شان تمام دنیا سے نرالی تھی، اور آپؐ کے اوپر اللہ جل شانہ کا دستِ رحمت اور شفقت تھا۔ مگر آپؐ اکثر ایسا نہیں کرتے تھے (سوائے جبکہ ارشادِ خداوندی کے مطابق آپؐ کو کوئی کام کرنا ہوتا۔ اس میں بھی لوگوں کو اس قدر آزادی کے ساتھ رائے دینے کی جرأت ہوا کرتی کہ عقل حیران ہے، اور اسلام میں یہ زندہ مثال دیکھنے میں آتی ہے کہ وہی دنیا میں جمہوریت کا بانی ہوا ہے۔ آپ اس قسم کے واقعہ کو صلح حدیبیہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔) کیونکہ آپؐ نے آیندہ کے لیے ایک مثال قائم کرنی تھی اور اپنے فعل و قول سے یہ ثابت کرنا تھا کہ آپؐ کے بعد خلفاء کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے۔ آپؐ کا مدعا یہ تھا کہ اگرچہ بہ حیثیت ظل اللہ کے خلیفہ

کو چند ایک ایسے حقوق حاصل ہیں جو اس کو رعایا سے سرفراز کرتے ہیں، لیکن عام طور سے اس کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کسی کام کو بھی رعایا کے صلاح و مشورہ کے بغیر نہ کرے۔ چنانچہ جب جنگ بدر کے بعد بہت سے کفار مکّہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو ان کے متعلق فیصلہ کے لیے آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور حضرت صدیق اکبرؓ کی غالب رائے سے قرار پایا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اگرچہ فاروق اعظمؓ کی رائے اس کے خلاف تھی، لیکن آنحضرتؐ خود بدولت ابو بکر صدیقؓ کی رائے سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس سے یہی مدعا تھا کہ آپؐ کے بعد ہونے والے خلفاء کو معلوم ہو جائے کہ امورات مملکت میں وہ برادرانِ دین کے مشورہ پر کاربند ہو، اور جس طرف کثرت رائے ہو وہی اس کو اختیار کرنا چاہئیے۔

یہ تھی اس خلافت کی صورت جو کہ دنیا میں آخری خلافت کا نمونہ تھی، اور جس کی مقدس بنیاد سرور کائناتؐ کے ہاتھوں رکھی گئی، اور جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا، اور جس کی خدمت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو کہ شجاعت، فیاضی، آزادی اور غیرت کے پتلے تھے۔ اس کے اٹل اصولوں نے دنیا کو منوادیا کہ وہ ذلیل لوگ جو کہ متمدن قوموں میں کوئی ہستی نہیں رکھتے تھے اس کے قائم کردہ نظامِ عمل کے ماتحت آکر امصار اور دیار کے مالک بن گئے اور اپنے اخلاق اور صفات کے وہ وہ حیرت انگیز نمونے دنیا کے سامنے پیش کیے کہ دیگر قومیں مبہوت رہ گئیں۔ کیا ایسی ایسی باتوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی قوم ذلیل اور خوار ہو سکتی ہے؟ جس قوم میں ایسے ایسے اصول ہوں کیا ہلاکت اس کے نزدیک آسکتی ہے؟ اگر باوجود ان باتوں کے وہ ذلیل اور خوار ہے۔ تو اس پر حیف ہے۔ اور جس قدر بھی خون کے آنسو اس پر بہائے جائیں، کم ہیں۔

اب ہم دکھلائیں گے کہ ہمارے آیندہ خلفاء کا کیا طرزِ عمل رہا ہے اور انہوں نے کہاں تک اس نظامِ عمل کی پابندی کی ہے اور اگر خلافت کو زوال آیا ہے تو اس کے کیا وجوہات تھے۔

# چوتھی فصل

## وفات بانئے خلافت

### اختلافِ اُمّت

جب آنحضرتؐ مرض موت میں مبتلا ہوئے۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ ''اے عائشہؓ! میں کمزور ہوں۔ امامت کے لیے باہر نہیں جاسکتا۔ اپنے والد ابا بکر صدیقؓ سے کہو کہ میری جگہ امامت کرائیں اور لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کی۔ حضورؐ میرے والد نہایت ہی نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ انہیں آپؐ سے بے حد محبّت ہے، جب آپؐ کو اپنی جگہ نہ پائیں گے تو بیقرار اور بے خود ہو جائیں گے، آپؐ اس کے لیے کسی اور کو مقرر کر دیجیے۔ لیکن سرور کائناتؐ کے بار بار ارشاد کرنے سے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امامت کے لیے کھڑے ہوں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مجبور ہو گئے، اور پانچوں وقت کی نماز کرانے لگے۔ فوت ہونے سے پیشتر آنحضرتؐ کی طبعیت کسی قدر سنبھل گئی تھی، اس لیے آپؐ حضرت علیؓ کا سہارا لے کر باہر تشریف لائے۔ جب مسجد میں داخل ہوئے تو اس وقت جماعت ہو رہی تھی اور سرور کائناتؐ کے یارِ غار جنہوں نے آپؐ پر سے جان و مال تصدق کرنے سے دریغ نہیں کیا تھا، امامت کرا رہے تھے۔ جب نمازیوں کو معلوم ہوا کہ شہنشاہِ دو جہاںؐ تشریف لا رہے ہیں تو اس لیے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آگاہ ہو جائیں، انہوں نے کھنکار نا شروع کر دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے معلوم کرنے کے بعد پیچھے آنا چاہا تا کہ اس خدائی گدّی کا مالک اپنے تخت پر تشریف لا کر لوگوں کی امامت کرائے لیکن سلطانِ دو جہاں نے اُن کی پشت پر دستِ مبارک رکھ دیا، اور واپس ہونے کی اجازت نہ دی اور خود اُن کی اقتدا میں دائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ لیکن چونکہ نہایت ہی کمزور تھے اس لیے کھڑے نہ ہو سکے اور بیٹھ کر ہی نماز ادا کی اور پھر ایسے گھر واپس آئے کہ کبھی بھی باہر تشریف نہ لا سکے۔

اس واقع سے ناظرین کیا خیال کرتے ہیں، کیا اب بھی کسی بات کی کسر رہ گئی ہے کہ آپؐ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا؟ کیا خلیفہ کے لیے امامت سے زیادہ کوئی اہم فرض ہو سکتا ہے؟ آخر آپؐ کا آخری وقت تھا، اگر آپؐ کا مطلب تھا کہ ابو بکر صدیقؓ کی بجائے کوئی اور آپؐ کا جانشین ہو تو آپؐ نے

اس نازک وقت میں کسی ایسے شخص کو امامت کے لیے حکم دینا تھا جو کہ آیندہ کے لیے آپؐ کی نظر میں اُمت کی امامت کے قابل ہو سکتا تھا۔ لیکن آپؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ہی اس منصب کے شایاں خیال کر کے نامزد کیا۔ مگر اس سے یہ بھی سمجھنا نہیں چاہیے کہ صدیق اکبرؓ کو امامت کا حکم دے کر گویا آپؐ نے یہ مثال قائم کر دی کہ میرے بعد وہی خلیفہ ہوں گے۔ بلکہ وہ حق ادا کیا جو کہ جانشین کی نامزدگی کے لیے آپؐ کے ذمہ تھا۔ آپؐ نے کس لیے حضرت علیؓ کو جو کہ آپؐ کے چچازاد برادر اور داماد تھے، اور علمِ دین میں سب صحابہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ چڑھ کر تھے، امامت کے لیے نہ کہا۔ حالانکہ علم میں افضل تر ہونے کے باعث ہمارے خیال میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت بہتر امام ہو سکتے تھے۔ اور کیوں حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا جو کہ ان کی نسبت دُور کے رشتہ دار تھے، یعنی خسر اور صرف دوست ہی تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ ایک گروہِ اسلام کے قول کے بموجب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے حقدار تھے، مگر آنحضرتؐ اپنے وصال کے وقت ایک ایسی مثال قائم کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت ابو بکر صدیقؓ امت کی امامت کے منصب جلیلہ پر سرفراز ہونے کے قابل ہیں۔ حقیقت میں بات یہ ہے کہ لوگوں میں ضد اور ہٹ بڑھ گئی ہے، اصل مطلب کی طرف کوئی بھی نہیں آتا۔ اگر کوئی حقیقت کا پردہ اُٹھانا چاہتا ہے تو الٹے اس کے سر ہو جاتے ہیں۔

شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی جانشین کے لیے نامزد کرتے، لیکن ہمیں دو امر مانع معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ خلافت کو اپنے ہی خاندان میں مخصوص کر کے ایک ایسی مثال چھوڑ دی جائے جو ممکن تھا آیندہ مہلک ثابت ہو۔ وہ اس وجہ سے کہ چونکہ امامت اِسی ایک خاندان میں رہنی تھی اس لیے ضروری نہیں تھا کہ اس کا ہر ایک رکن تا قیامت اس کا اہل ہو سکتا۔ اکثر خاندان میں قابل اور نا قابل بھی ہوتے ہیں۔ اگر اسی ایک خاندان میں امامت رہتی تو قابل کے ساتھ نا قابل بھی امام ہوتے جس سے خلافت کو بہت ضعف پہنچتا اور ایک قسم کی شخصی حکومت قائم ہو جاتی۔ دوسرے یہ بات تھی کہ اسلام کا شروع شروع کا زمانہ تھا اور ابھی ابھی (صحابہ رضی اللہ عنہم کو مستثنےٰ کرتے ہوئے) لوگوں کے اعتقادِ دین اسلام میں راسخ نہیں ہوئے تھے جیسا کہ تاریخ شاید ہے، آنحضرتؐ کے فوت ہوتے ہی عرب کے کس قدر قبائل مرتد ہو گئے، اس لیے یہ لازمی تھا کہ ایسے خلیفہ کا تقرر ہو جو کہ ان میں آنحضرتؐ کے بعد سب سے زیادہ قابل تعظیم اور معاملاتِ سیاست میں نہایت ہی اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو۔ آپ ناراض نہ ہو جیوٴ۔ اگر میں صاف طور سے عرض کر دوں کہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ تدابیر ملکی میں اُن سے زیادہ ماہر نہیں تھے۔ اگرچہ جیسا کہ ہم نے پیشتر بھی عرض کیا ہے وہ علمِ دین میں سب پر فضلیت رکھتے تھے۔ اس امر کا ثبوت آپ کو آیندہ اوراق میں ملے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں کس قدر اُمت کا شیرازہ بکھر گیا، اور چند ایک خود غرض اور حریص لوگوں کے ہاتھوں سے آپ کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ حالانکہ وہی حریص لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں بھی موجود تھے۔ مگر ان دونوں کی حسنِ تدبیر سے اُن کو سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی اور جب انہوں نے دیکھا کہ خلافت پر ایک کمزور ہستی ہے تو ان کے حرص اور آز کی آگ تیز ہو گئی، اور اُمت میں تفرقہ ڈالنے پر آمادہ ہو گئے۔

جب آنحضرتؐ منعمِ حقیقی سے جا ملے اور کہرام مچ گیا تو انصار نے جو کہ مدینہ کے رہنے والے تھے ایک جلسہ منعقد کیا تاکہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر کے سلطنت کے کاموں میں اس کے تابع فرمان ہوں۔ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو آپ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر فوراً وہاں تشریف لے گئے اور دیکھا کہ واقعی انصار حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر خلافتِ رسولؐ کی بیعت کرنے والے ہیں۔ انصار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ہم اپنے لوگوں میں سے ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تاکہ انتظام اُمت قائم رہے۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور پہلے آپ رضی اللہ عنہ نے انصار کے مناقب اور اوصاف بیان کیے اور فرمایا کہ انہوں نے حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین پر بڑے بڑے احسان کیے، اور اس وقت جبکہ سرورِ کائنات کو اُن کے وطن والوں نے سخت تکلیفیں دے کر نکال دیا تھا انصار نے ہی ان کی امداد کی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اسی سبب سے آنحضرتؐ نے وفات کے وقت ارشاد کیا تھا کہ قرآن شریف اور اپنی آل کو تم میں چھوڑتا ہوں۔ جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ اور نیز انصار کے ساتھ نہایت ہی سلوک اور مہربانی کے ساتھ پیش آنا۔ آخر میں آپ نے فرمایا "اے گروہِ انصار ہم تمہاری بزرگی اور عزت کا اقرار کرتے ہیں مگر خلافت اور امامت کا حق قریش کا ہے کیونکہ خود سرورِ کائنات نے فرمایا ہے، "امام قریش میں ہوں گے۔" لہذا تم خلافت قریش میں ہی رکھو اور رسالت مآبؐ کی منشا کے خلاف کچھ نہ کرو، ورنہ بہت جھگڑے اٹھیں گے اور سخت فساد ہو گا۔

اللہ اللہ اس تقریر میں کیا جادو بھرا ہوا تھا اور کیا سیاست اور تدبّر آشکارا تھی کہ وہی انصار جو کہ ایک گھڑی پیشتر امامت کو اپنے لیے مخصوص کرنے والے تھے، ٹھنڈے پڑ گئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر کاربند ہوتے ہوئے خواہش کرنے لگے کہ ہم قریش میں سے خلیفہ کے انتخاب کرنے پر رضامند ہیں۔ آپ ذرا غور کیجیے کہ جمہوریت اور آزادی آراء کی کیسی اعلیٰ مثال نظر آتی ہے۔

انصار میں سے ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خلافت کے لیے نام لیا، پھر فوراً اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر کیا تھا، ہر ایک ان کی پیروی کرنے لگا اور اس وقت سب کی رائے سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ کیا آج کل کی مہذب دنیا میں یہ طریقہ انتخاب نہیں ہے۔ ایک نام تجویز کیا جاتا ہے پھر دوسرا نام اس کے مقابلہ پر لیا جاتا ہے، پھر جس طرف کثرت رائے ہو وہی انتخاب ہوتا ہے۔ کیا حضرت ابو بکر صدیقؓ کے انتخاب میں یہ صورت پیش نہیں آئی۔ ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کرتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیتے ہیں جو کہ ان کی رائے کے مطابق خلافت کے قابل ہیں کیونکہ کسی کی آزادی رائے کو کوئی شخص نہیں روک سکتا۔ ہر ایک کو حق حاصل ہے، بلا روک ٹوک اظہار رائے کرے۔ اس سے یہ مطلب لینا کہ معاذ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ سے کسی قسم کا عناد تھا ان پاک ہستیوں پر کتنا بڑا بہتان لگانا ہے۔ چونکہ ہمارے پاس اس وقت کے پُورے پُورے اعداد و شمار نہیں پہنچے ہیں اس لیے ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس قدر ووٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں تھے اور کس قدر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں۔ بہر حال انتخاب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کثرت رائے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں تھی۔

یہ بھی بالکل درست ہے کہ اس انتخاب کے بعد چھ ماہ تک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی۔ ممکن ہے کہ ان کو یہ خیال رہا ہو گا کہ خلافت کا میرا حق تھا لیکن جب ان پر حقیقت کا انکشاف ہو گیا تو اس پاک باز، نیک طینت، مقدّس انسان (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے خود بخود ان سے بیعت کر لی، اور خلافت کے امورات کی انجام دہی میں ان کے دست و بازو ہو گئے، اور ہر ایک بات میں ان کا مشورہ سب سے مقدم سمجھا جانے لگا۔

اصل واقعاتِ اختلاف تو یہ ہیں جو کہ اصولی نہیں تھے بلکہ محض اختلاف رائے تھی، لیکن لوگوں نے اس کو

کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام تک تواریخ کے ورق اُلٹ ڈالیئے۔ آپ کہیں بھی نہیں پائیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان دونوں خلفاء کے درمیان کبھی بھی کسی قسم کی ناچاقی واقع ہوئی تھی۔ بلکہ وہ ہر وقت شیر و شکر رہتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر ان لوگوں کے لیے یہ امر قابل غور ہے جو کہ اپنے تعصّب اور ضد کے باعث حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے بے نظیر اور فنافی الاسلام انسان کی پاک زندگی پر بہتان لگاتے ہوئے (توبہ نعوذ باللہ) انہیں علانیہ گالیاں دیتے ہیں کہ نہایت ہی معتبر اور مستند تواریخ (طبری وغیرہ) ثابت کرتی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں خواہش ظاہر کی تھی کہ خاندانِ نبوت کے ساتھ رشتہ قائم ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی صاحبزادی کے عقد کے لیے کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دل و جان سے قبول فرما کر اپنی صاحبزادی حضرت ام کلثوم (جو کہ حضرت فاطمۃ الزہرا کے بطنِ مبارک سے تھیں) کا عقد بہ رضاء و رغبت ان کے ساتھ کر دیا۔ اس سے زیادہ ان کے اتفاق اور اتحاد کا ثبوت اور کیا مل سکتا ہے۔ افسوس سے کہا جاتا ہے کہ باوجود ان باتوں کے ہوتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دشمن کہا جاتا ہے اور آپ کی حمایت پر کھڑے ہو کر اس شخص پر تبرّا کیا جاتا ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دامادی کا فخر حاصل تھا۔ نہایت ہی رنج کی بات ہے کہ معاملہ تو کچھ بھی نہیں، لیکن رائی کا پہاڑ بن رہا ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم ہوا ہوتا تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بعد خلیفہ بننا کیوں منظور کر لیتے؟ ان کو چاہیے تھا کہ اُس وقت بھی انکار کر دیتے اور کہتے کہ چونکہ شروع شروع میں مجھ پر ظلم کیا گیا اور میرا حق چھین لیا گیا ہے اس لیے میری عزت گوارا نہیں کرتی کہ اب میں خلیفہ بنوں۔ لیکن انہوں نے ایسا ہرگز نہیں کیا بلکہ جب اجماع اُمت نے ان کو باتفاق رائے منتخب کر لیا تو انہوں نے نہایت ہی خوشی کے ساتھ اس کو منظور کر لیا۔

جہاں تک واقعات ظاہر کر رہے ہیں بات تو یہ ہے، اور خواہ مخواہ دو گروہ بن رہے ہیں، جن کے باعث اسلام تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ کیا بدیں وجوہات آپ خیال کر سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رُوح مبارک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں ایسے ایسے لغو کلمات سننے سے خوش ہوتی ہو گی؟ آپ پر تبرّا کرنے والوں پر "مدعی سُست و گواہ چُست" کا مقولہ صادق آتا ہے۔ جن کی اصل میں رنجش ہونی چاہیے تھی وہ تو آپس میں خوش خوش رہے اور بعد کے لوگوں نے خواہ مخواہ ان کے خلاف عجیب عجیب باتیں گھڑ لیں۔ کتب تواریخ میں کہیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس زمانہ میں اسلام میں دو گروہ پیدا ہو

گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کو کون نہیں جانتا۔ اسلام میں اس سے زیادہ شاندار اور پُرامن زمانہ کوئی بھی نہیں ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ کوئی ایک فرد بھی آپ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا دم بھرتا تھا؟ ہر گز ہر گز نہیں۔ پھر آخر یہ مخالفت کہاں سے آگئی۔ محض لوگوں کی خود غرضی ہے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد صرف ذرا سا اختلاف واقع ہوا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس قسم کے اختلاف تو آج کل روزانہ انگستان میں اخباروں کے ذریعہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر یہی حال وہاں ہوں تو خدا معلوم کس قدر خونریزی کی نوبت آئے۔ افسوس صد افسوس مسلمانوں کے ادبار کی یہ ایک نہایت ہی زبردست نشانی ہے کہ تعصّب اور ضد کے سبب حقیقت کو پس پشت ڈال کر خواہ مخواہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ اب اسلام پر ایسا نازک وقت آگیا ہے کہ یہ دونوں گروہ (شیعہ و سنی) غور کریں اور تعصّب کو دُور کر کے ایک دوسرے کے گلے مل کر اسلام کی بہتری اور ترقی کی تدابیر سوچیں۔ ورنہ یاد رکھیں کہ ان کے ایسے طرزِ عمل سے بہت کچھ اسلام کی ہستی فنا ہو چکی ہے، اور جو ذرا سی باقی ہے وہ بھی معرض خطر میں ہے۔

حضرات شیخین رضی اللہ عنہم (ابو بکر اور عمر) کے مخالفین ایک اور الزام ان کے سر تھوپتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ہی جب انصار نے اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرنے کے لیے جلسہ کیا تھا تو یہ دونوں صحابہ رضی اللہ عنہم اس اُٹھتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے، اور سرور کائناتؐ کا جنازہ پڑا رہا تھا، اور آپؐ کے تجہیز و تکفین میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ (توبہ نعوذ باللہ) اُنہیں دنیا کی خواہش تھی اور ہوا و حرص میں گرفتار تھے اسی لیے آنحضرتؐ کو چھوڑ کر خود تو خلافت کے دھندوں میں مشغول ہو گئے اور اہلبیت آنحضرتؐ کے پاس بیٹھے رہے۔ اگر ان کو شہنشاہِ دو جہان سے محبت ہوتی تو وہ کبھی بھی گوارا نہ کرتے کہ ان کا محبوب آقا تو وفات پا جائے اور وہ خود اِدھر اُدھر اپنی دنیوی اغراض کے حصول کے لیے پھرتے رہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کا الزام عاید کرتے وقت یہ لوگ انصاف کو ہاتھ سے دے دیتے ہیں۔ اگر وہ انصار کے مجمع میں تشریف لے گئے تو آخر اس وقت کون جاتا۔ کیا حضرت علیؓ وہاں خود تشریف لے جاتے؟ لیکن یہ تو ناممکن معلوم ہوتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ ان کے خسر اور چچازاد بھائی تھے، اس لیے ان کا فرض تھا کہ سرورِ کائناتؐ کے اہلبیت ہونے کی حیثیت میں ان کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہوتے۔ اگر کوئی بھی نہ جاتا تو سخت اندیشہ تھا کہ وہ کسی کو خلیفہ بنا لیتے اور خون و قتل تک کی نوبت آجاتی۔ اس لیے ہر دو صحابہؓ تشریف لے گئے کیونکہ اس وقت تمام اُمت اسلام میں یہی سب سے زیادہ قابلِ تعظیم تھے اور انہیں کا رعب و داب اس قدر

تھا کہ تمام اُن سے خوف کھاتے تھے۔ وہ اس لیے گئے کہ رسول اللہؐ کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودہ (اسلام) معرضِ خطر میں تھا۔ ان کے اس وقت جانے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو آنحضرتؐ سے بہت زیادہ محبت تھی کیونکہ آپؐ کی تعلیم کا ان لوگوں پر اس قدر زیادہ اثر ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو دنیا کی سب چیزوں سے افضل خیال کرتے تھے۔ اور ان کو ان کے مولے کی یہ تعلیم تھی کہ ہر ایک شے فانی ہے اور صرف ذاتِ الٰہی کو ہی کو بقاء ہے۔ ان کو اس وقت خیال گزرا کہ آنحضرتؐ تو فوت ہو گئے اور اب وہ کسی صورت واپس ہونے کے نہیں۔ اس توحید الٰہی کو جس کی بنیاد دنیا میں ڈال کر اس کی اشاعت کے لیے ایک باضابطہ نظام قائم کر گئے ہیں ان کے بعد مستحکم کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اُنہوں نے وہاں پہنچ کر اپنے تدبّر اور سیاست سے اس اُٹھتی آگ کو آن کی آن میں ایسا ٹھنڈا کیا کہ پھر اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ انہوں نے اپنے اس وقت کے طرزِ عمل سے اسلام کے اس نو خیز پودے کو زمانہ کے حوادثات سے بچا لیا اور پھر اپنے مولا اور محسن کے دفن و کفن میں شامل ہو گئے۔ انصاف کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو کونسی بُرائی کی۔ کیا انہوں نے ایسا کرنے سے اسلام کے حق میں کوئی شرّ پیدا کر دیا؟ کیا ان کے طرزِ عمل سے دنیائے اسلام میں ایک نئے انقلاب کا سیلاب نہ رُک گیا۔ اگر وہ بروقت وہاں نہ پہنچتے تو یاد رکھیئے، اسلام کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا اور ممکن تھا کہ یہ نونہال پودہ جڑ سے اکھڑ جاتا۔

ہمارے خیال میں اس قسم کے اعتراضات اور مخالفتوں سے سوائے اس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ اسلام دن بدن کمزور ہو رہا ہے۔ اسی زمانہ میں جبکہ اس قسم کے واقعات پیش آئے، ایسی مخالف باتوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور تھا کہ حضرات شیخینؓ کے زمانوں میں بد نظمی اور بد انتظامی پھیلتی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا زمانہ جیسا کہ ہم پیشتر بھی کہہ آئے ہیں تاریخ اسلام میں نہایت ہی پُر امن زمانہ گزرا ہے۔ اس میں کسی قسم کی بدامنی دیکھنے میں نہیں آئی، اور ہر ایک فرد و بشر اسلام کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹانے پر مستعد تھا۔ اس وقت ان باتوں کا کسی کو سان گمان بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بعد میں فتنہ پرداز لوگوں نے اسلام کو کمزور کرنے کے لیے گھڑی ہیں۔

# پانچویں فصل

## خلافت فاروقیؓ

### شاندار عہد

آنحضرتؐ کے بعد خلیفہ اسلام کی زندگی کا عملی نمونہ ہم حضرت فاروق اعظمؓ کی ذات مبارک میں پاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دس سالہ عہد حکومت میں وہ وہ کام کیے جو کہ ایک خلیفہ کے لیے کلیۃً رہنمائی کا کام دے سکتے ہیں۔ اگر بعد کے خلفاء ان کی زندگی کو اپنے پیش نظر رکھ کر امورات خلافت انجام دیتے تو آج اسلام یہ دن نہ دیکھتا۔ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے دکھلایا کہ خلیفہ کے ذمہ خدائے عزوجل اور رعایا کے کون کون سے حقوق ہیں، اور اس کے فرائض میں کیا کیا باتیں داخل ہیں۔ ان کا ایسا شاندار عہد بعد میں کبھی بھی دیکھنے میں نہ آیا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی مثال سامنے ہوتے ہوئے بعد کے زمانے کے خلفاء ایسے ایسے افعال قبیحہ کے مرتکب ہوتے رہے جو کہ نہایت ہی شرمناک ہونے کے ساتھ اسلام کی تباہی اور بربادی کے پیش خیمہ تھے۔ آنحضرتؐ نے دنیا میں آخری خلافت قائم کی۔ آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاص کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ایسے شاندار طریقہ پر چلایا کہ اب وہ خواب وخیال نظر آرہا ہے۔

خلافت کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی آپ نے اپنے بے نظیر تدبّر اور سیاست سے وہ کام کیا جو کہ لاجواب تھا۔ حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ ان کو دربار نبویؐ سے ''سیف اللہ'' کا مقدّس لقب ملا ہوا تھا۔ ان کی شجاعت اور جنگی تدابیر کی دھاک تمام عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے اسلام کی وہ وہ خدمات انجام دی تھیں کہ لوگوں کو گمان ہو رہا تھا کہ اس قدر وسیع فتوحاتِ اسلامی صرف انہی کی طفیل سے حاصل ہو رہی ہیں۔ لیکن باوجود اس قدر محاسن اور ہر دلعزیزی کے جب وہ ایک قصیدہ کے صلہ میں ایک شاعر کو بہت سا روپیہ انعام میں دے دیتے ہیں تو خلیفۂ ثانی ان سے مواخذہ کرتے ہیں، اور ثبوت بہم پہنچنے پر اس حیرت انگیز جرنیل، حامی دین متین اور اسلام کے دلدادہ کو برطرف کر کے کیسی اعلیٰ وجوہات پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ''خالد رضی اللہ عنہ نے اس قدر زر ایک قصیدہ کے صلہ میں شاعر کو دے دیا۔ اگر اُنہوں نے بیت المال سے دیا تو وہ تو مسلمانوں کا مال ہے، انہوں نے خیانت کی اس لیے وہ برطرفی کے قابل ہیں۔ اور اگر اپنے

پاس سے دیا تو اسراف کیا، اور اس لیے ایک مسرف مسلمانوں کا امیر نہیں ہو سکتا۔ اس سبب سے بھی وہ قابل معزولی ہیں۔

غور کیجیے، یہ کیسی مثال ہے جس سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے قائم کرنے سے انہوں نے آنے والی نسلوں پر یہ ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے امیر کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ اس کو بیت المال یا آج کل کی اصطلاح میں پبلک ٹریژری پر کچھ حق حاصل نہیں۔ وہ تو مسلمانوں کی ملک ہے اور خلیفہ یا امیر اس کا امین ہے۔

اب انہوں نے اشاعت اسلام کی طرف توجہ کی کیونکہ خلافت کے سب سے بڑے فرائض میں یہی سب سے اہم فرض تھا۔ ایران کی طرف فوجیں روانہ کیں اور آہستہ آہستہ نہایت ہی قلیل عرصہ میں ان کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔ لیکن یاد رہے کہ لوگوں کی مذہبی آزادی کسی صورت میں سلب نہیں کی۔ اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ان کو وہی حقوق دیئے جو کہ مسلمانوں کو حاصل تھے، اور گر اپنے ہی مذہب پر رہے تو ان کے مذہبی امورات میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی بلکہ ان کو نہایت ہی آزادی کے ساتھ فرائض مذہبی کی اجازت دی۔ ہاں صرف اسی قدر کیا کہ ان کو اپنے تابع فرمان کر لیا تاکہ مسلمانوں کے خلط ملط اور فیضِ صحبت سے وہ خود بخود ہی اسلام کی طرف راغب ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ لوگ نہایت جلدی بہ رضا و رغبت دائرہ اسلام میں آ گئے۔

شام میں معرکہ آرائیوں کے لیے فوجیں روانہ کیں، مصر کو قبضہ اسلام میں لایا گیا، رومیوں کے ساتھ جنگیں کر کے ان کو مطیع کیا۔ یہ سب کچھ کس لیے؟ انہوں نے اشاعتِ اسلام کو اپنے اوپر فرض سمجھ رکھا تھا اور آنحضرتؐ کی پیروی کرنی تھی نہ کہ محلوں کے اندر بیٹھ کر عیش و عشرت کی مجلسیں گرم کرنی تھیں اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر خلافت کے نشہ میں مست رہنا تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اشاعت اسلام کے وہی طریقے برتے جن کا ذکر پیشتر بھی کیا جا چکا ہے، یعنی اول دعوتِ اسلام، پھر قبولِ جزیہ، اور سب سے آخر مجبور ہو کر تلوار۔ چنانچہ اس جگہ ایک چھوٹی سی مثال بیان کی جاتی ہے جس سے ناظرین معلوم کریں گے کہ ان کا اشاعتِ اسلام کا کیا طریقہ تھا، اور یہ جو مسلمانوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو بزورِ تلوار پھیلایا کس حد تک درست ہے۔

معرکہ یرموک میں رومیوں کا سپہ سالار باہان اور لشکر اسلام کے امیر ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔ جب رومیوں نے مسلمانوں کا بڑھتا ہوا سیلاب دیکھا کہ کسی جگہ رُکتا نظر نہیں آتا تو ان کے سپہ سالار نے رات کے وقت ایک مجلس قائم کر کے کل سرداروں کو جمع کیا اور کہا کہ مسلمانوں کو شام کی دولت کا مزہ پڑ چکا ہے، بہتر

یہ ہے کہ مال وزر کی طمع دے کر ان کو یہاں سے ٹالا دیا جائے۔ اس پر سب متفق ہو گئے اور دوسرے روز ہی حضرت ابو عبیدہؓ کی خدمت میں ایک قاصد روانہ کیا گیا جس کے ہاتھ کہلا بھیجا گیا کہ وہ اپنے کسی معزز افسر کو روانہ کریں تاکہ اس سے صلح کی گفتگو کی جائے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جو کہ سپہ سالاری سے معزول ہو کر حضرت ابو عبیدہؓ کے ماتحت کئے گئے تھے، اس سفارت کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ دوسرے روز حضرت خالد رضی اللہ عنہ رومیوں کے لشکر گاہ میں تشریف لے گئے۔ رومیوں نے اپنی شان و شوکت دکھلانے کے لیے یہ اہتمام کر چھوڑا تھا کہ اس راستہ کے دونوں جانب جس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے گزرنا تھا سواروں کی صفیں قائم کی ہوئی تھیں جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھے، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نہایت ہی بے پرواہی کے ساتھ گزر رہے تھے۔ جب وہ باہان کے پاس پہنچے تو اس نے نہایت ہی احترام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور معمولی بات چیت کے بعد اس نے تقریر شروع کی۔ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ کی تعریف کی، پھر فخر سے کہا کہ ہمارا بادشاہ سب بادشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ ابھی یہ الفاظ مترجم کی زبان سے ختم نہیں ہوئے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے باہان کو روک دیا اور کہا "تمہارا بادشاہ ایسا ہی ہو گا، لیکن ہم نے جس کو سردار بنا رکھا ہے اس کو ایک لحظہ کے لیے اگر بادشاہی کا خیال آئے تو ہم فوراً اس کو معزول کر دیں۔" ملاحظہ ہو خلیفہ کی حیثیت، خلیفہ فرعون کا ہمسر نہیں ہوا کرتا تھا۔ باہان نے پھر تقریر شروع کی، اور اپنے جاہ و دولت کا فخر بیان کر کے کہا۔ "اے اہل عرب! تمہارے بہت سے لوگ ہماری سرزمین پر آ کر آباد ہوئے تو ہم نے ان کا ہر ایک حالت میں لحاظ رکھا، لیکن اس کا عوض تم یہ دیتے ہو کہ ہمارے ملک پر چڑھ آئے ہو۔ تم جانتے ہو کہ دنیا میں تم سے زیادہ جاہل، وحشی اور بے سروسامان قوم کوئی نہیں ہے۔ خیر ہم اس پر بھی درگزر کرتے ہیں، اور اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو انعام کے طور پر سپہ سالار کو دس ہزار دینار اور افسروں کو ہزار ہزار اور عام سپاہیوں کو دس دس دینار دلا دیں گے۔" جب باہان اپنی تقریر ختم کر چکا تو خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ ایستادہ ہوئے اور خدائے عزوجل کی حمد و ثنا اور سرور کائناتؐ کی نعت کے بعد یوں فرمایا۔ "بے شک تم دولت مند اور مالدار ہو اور یہ بھی درست ہے کہ تم نے ان عربوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جو کہ تمہارے ملک میں آ کر آباد ہوئے۔ لیکن یہ سلوک کچھ ہماری خاطر نہیں کیا بلکہ ان کو عیسائی بنانے کی ترغیب تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ ہمارے مقابلہ پر تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ بھی تم بجا کہتے ہو کہ ہم نہایت ہی محتاج، تنگدست اور خانہ بدوش تھے۔ ہمارے ظلم اور جہالت کا یہ حال تھا کہ طاقتور کمزور کو پیسے ڈالتا تھا اور آپس

میں لڑتے رہتے تھے۔ خدائے واحد کے نام سے ناواقف تھے اور گھر گھر بُت بنا رکھے تھے۔ لیکن اللہ جل شانہ نے ہم پر رحم کیا اور اپنے فضل و کرم سے ہم پر ایک نبی بھیجا جو کہ ہماری ہی قوم میں سے تھا۔ اس نے ہمیں توحید سکھلائی اور بتلایا کہ خدائے تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ بیوی اور اولاد نہیں رکھتا۔ اس نے ہم کو یہ بھی حکم دیا کہ ان عقائد کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرو، جس نے ان کو مانا وہ مسلمان ہے اور ہمارا بھائی ہے۔ جس نے نہ مانا لیکن جزیہ دینا قبول کرتا ہے اس کے ہم حامی اور مددگار ہیں۔ جس کو دونوں سے انکار ہو اس کے لیے تلوار ہے۔''

یہ تھا طریقہ اشاعت اسلام کا جس کے لیے وہ لوگ پہاڑوں، دریاؤں اور ریگستانوں کو ایک کر دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مشن ہی قرار دیا ہوا تھا کہ توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلائیں جس کی خاطر خدا تعالیٰ نے نبیؐ کو اس زمین پر اتارا، اور جس توحید کو حضرت عمرؓ سے زیادہ کسی نے بھی نہ سمجھا۔ کہتے ہیں، فاروق اعظمؓ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئے تو جب حجر اسود کو بوسہ کی نوبت آئی تو آپ اس کے قریب کھڑے ہو گئے اور تلوار نکال کر اس کی نوک اسے چبھو کر یوں فرمانے لگے۔ ''اے پتھر تو ایک پتھر ہی ہے، نہ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ نقصان۔''

اور ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ ''اے پتھر میں تجھ کو ایک پتھر ہی خیال کرتا ہوں اور اگر میرے آقا نے تجھے بوسہ نہ دیا ہوتا تو تجھے اس جگہ پھینکتا جہاں تیرا نشان نہ ملتا۔'' یہ تھی توحید اور یہ تھے ان لوگوں کے اعتقاد۔ وہی لوگ جو کہ خدا کے نام سے بیگانہ تھے اب ایسے واقف ہوئے کہ دنیا کی تمام نعمتوں کو اس کے آگے ہیچ خیال کرنے لگے۔

حضرت عمرؓ نے خلافت کو امارت نہیں سمجھ رکھا تھا۔ وہ یہ نہیں خیال کرتے تھے کہ خلیفہ تمام دنیا کا اس معنی میں مالک ہے کہ لوگ اس کے سامنے غلاموں کی حیثیت رکھیں۔ ان کا ایمان تھا کہ خلیفہ رعایا کا خدمت گزار رہے۔ انہوں نے عالیشان محلات تعمیر کر کے ان کو فوجوں کے پہروں کے اندر نہیں گھیرا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی پر جاجب اور دربان نہیں بٹھا رکھے تھے کہ داد خواہان تک بار نہ پا سکیں۔ وہ بلاشک و شبہ عرب، شام، مصر، روم اور ایران کے شہنشاہ تھے، اور اس وقت کے بڑے بڑے سلطان ان کے نام سے کانپتے تھے۔ مگر ان کا کیا حال تھا، وہی عرب کا سلطان ننگے سر اور ننگے پاؤں بازاروں میں پھر رہا ہے اور بیواؤں کے سودے اپنے کندھے پر اٹھائے جا رہا ہے۔ وہی شام فاتح مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا دھوپ سینک رہا ہے۔ وہی مصر کا شہنشاہ اینٹیں بنا رہا ہے

اور پاؤں سے لے کر گھٹنوں تک کیچڑ میں آلودہ ہو رہا ہے۔ وہی روم کا بادشاہ اِدھر اُدھر مشک اٹھائے لوگوں کو پانی پلا رہا ہے۔ وہی ایران کا کسریٰ جبکہ بیت المال کا ایک اُونٹ گم ہو جاتا ہے تو اس کو سخت دھوپ میں ڈھونڈ رہا ہے۔ غرضیکہ اس کی ایک عجیب شان ہے، لیکن باوجود اس سادگی اور منکسر المزاجی کے اس کے رعب وداب کا یہ حال ہے کہ جب غیر ملکوں کے سفراء اس کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو تھر تھر کانپتے ہیں۔ وہ خود ہی ایسی سادہ زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ اپنے تمام امیروں اور والیوں کو بھی حکم دیتا ہے کہ نہایت ہی سادہ طرز زندگی رکھیں۔

جب حضرت سعد ابی وقاصؓ کوفہ کے والی ہوتے ہیں تو وہاں اپنے رہنے کے لیے ایک مکان بنواتے ہیں اور اس کے باہر ڈیوڑھی رکھتے ہیں۔ کوئی دربار خلافت میں شکایت کرتا ہے کہ سعدؓ نے اپنے محل سرا کے باہر ڈیوڑھی بنا رکھی ہے، وہ غریبوں اور مفلسوں کا والی حکم دیتا ہے کہ مکان کے اس حصہ کو حوالہ آگ کیا جائے کیونکہ ایک فریادی کی آواز مکان کے اندر تک پہنچنی مشکل ہے۔

جب معاویہؓ، وہی معاویہؓ جس کے رعب وداب کی آیندہ زمانہ میں کوئی حد نہیں رہی تھی، اور جس کا شاہانہ دربار قیصر و کسریٰ کے دربار کو مات کرتا تھا، جس نے خلافت کو امارت میں تبدیل کر کے اس کی جمہوریت کی شان کو ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ کر دیا، جب فاروق اعظمؓ کے دربار مدینہ میں حاضر ہوتا ہے تو ملک شام کا فوق البھڑک لباس زیب بدن کئے ہوئے تھا۔ وہ فقیروں کا شہنشاہ اس کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتا ہے اور زبانِ حال سے ارشاد کرتا ہے۔ ''کیا اتنی جلدی اپنا ملکی لباس بھول گیا اور عیش و عشرت میں پھنس گیا۔'' لیکن وہ عرب کا کسریٰ (حضرت عمرؓ معاویہؓ کو عرب کا کسرا کہا کرتے تھے) بھی بلا کا مدبّر واقع ہوا تھا، فوراً اوپر کا ریشمی لباس اتارتا ہے اور نیچے وہی عرب کا سادہ لباس دکھاتا ہے اور کہتا ہے۔ ''ہم نے اپنی قومی طرز زندگی تبدیل نہیں کی لیکن شامیوں میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے ان کا لباس پہن لیتے ہیں۔''

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مساوات کی ایک نہایت ہی شگفتہ مثال قابل بیان ہے جس سے معلوم ہوگا کہ آپ نے اس صفتِ اسلام کو کس حد تک قائم رکھا اور اس کے متعلق کس شاندار طریقہ سے اپنے عدل وانصاف کو کام میں لایا۔ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے دکھلایا کہ ایک فقیر مسلمان ایک بادشاہ متکبر کے برابر درجہ رکھتا ہے اور دونوں کو اسلام ایک ہی حقوق عطا کرتا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ بنی غسّان کا آخری بادشاہ جبلہ ابن الہیم تھا۔ جب فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں فتح مند اسلامی لشکر اس کے ملک کو اپنے قبضہ میں لے آیا تو وہ آپ کی قدم بوسی کے لیے مدینہ منورہ میں حاضر ہوا۔ بنی غسّان کے حکمرانوں کی عرب میں نہایت ہی شہرت تھی اور

ان کی دولت اور حشمت کے فسانے زبان زدِ خلائق تھے، اور بدوی اپنے خیموں میں بیٹھ کر قصے کہانیوں کی طرح ان کو دُہرایا کرتے تھے۔ جب وہ مدینہ طیبّہ میں داخل ہوا تو اس کے آنے سے پیشتر ہی شہر میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ لوگ جوق جوق بازاروں میں اس کا جلوس دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے اور عورتوں تک کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگیں۔ حضرت عمرؓ اس سے نہایت ہی تپاک سے پیش آئے اور خلافِ عادت اتنی تعظیم کی کہ جتنی کسی بڑے سے بڑے اور معزز سے معزز مہاجر کی ہو سکتی تھی۔

لیکن ایسا اتفاق ہوا کہ وہ مدینہ کی گلیوں میں سے گزر رہا تھا، اور عرب کے پرانے متکبرانہ طریقہ سے اس کے آزار بند (تہمت) کے کونے زمین پر لوٹتے جاتے تھے۔ اس کی اس وضع کو جس کی آنحضرتؐ نے مخالفت کی تھی بنی طے کے ایک صحابیؓ نے دیکھا تو نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور ایک ایسا ہاتھ مارا کہ متکبر جبلہ کی آزار کھل کر نیچے گر پڑی۔ بادشاہ کو صحابیؓ کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا، اور غضب میں آکر اس کے ایک تھپڑ مار بیٹھا۔ صحابیؓ نے حضرت عمرؓ کے دربار میں اس کی شکایت کی۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ صحابیؓ نے جو کچھ کیا تھا نیک نیتی سے کیا تھا، لیکن بادشاہ غسّان کا غصہ نفس پرستی کی وجہ سے تھا، لہذا صحابیؓ کو حق حاصل ہے کہ وہ جبلہ کے بھی ایک تھپڑ مارے۔

جب جبلہ نے یہ عجیب و غریب فیصلہ سنا تو نہایت ہی سٹ پٹایا اور کہنے لگا۔ ''میں بادشاہ ہوں اور یہ ایک معمولی شخص ہے۔'' حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ''اسلام نے وہ جاہلیت کی تفریقیں مٹادیں۔ امیر و فقیر، بادشاہ اور رعایا یہاں سب برابر ہیں۔'' اس پر جبلہ نے کہا ''اگر مسلمان ہونے سے میری عزت اور توقیر میں فرق آتا ہے تو میں اس عیسائی مذہب پر قائم رہنا پسند کروں گا، مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک ادنیٰ شخص مجھ کو تھپڑ مارے''۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ''دیکھ لے، اگر اب تو نے اسلام سے منحرف ہونے کا ذرا بھی خیال کیا تو ہم تجھ کو قتل کر دیں گے کیونکہ اسلام نے مرتد کی سزا موت رکھی ہے۔'' جب اس نے یہ سُنا تو دل میں ڈرا اور مہلت چاہی کہ ایک رات کی اجازت دی جائے تاکہ اس معاملہ پر غور کروں۔ یہ درخواست حضرت عمرؓ نے منظور کر لی۔ چنانچہ وہ اپنی فرودگاہ میں واپس آیا اور صبح ہونے سے پہلے ہی چھپ کر بھاگ گیا۔

انصاف دیکھیے، آپ کے فرزند ابو شحمہ شراب پیتا ہے، دربارِ خلافت میں اس کی شکایت پہنچتی ہے۔ عمر فاروقؓ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو جاتا ہے۔ فوراً حکم دیتے ہیں کہ اس کو پکڑ کر لاؤ۔ جب حاضر ہوتا ہے تو شرع کی حد اس پر لگائی جاتی ہے۔ کہرام مچ جاتا ہے کہ حضرت اس کی بجائے ہمیں لگا لیجیے وہ اتنی بڑی سزا کو برداشت نہیں

کر سکتا۔ مگر وہ انصاف مجسّم عدل کا علم بردار اسی بات پر مصر ہوتا ہے کہ جس نے جرم کیا ہے وہی اس کی سزا بھگتے۔ چنانچہ وہ فرزند خلیفہ اپنے باپ کے سامنے ستّر کوڑے کھاتا ہے اور گر کر جان دے دیتا ہے، لیکن اس پر بھی بس نہیں ہوتا اور حکم دیا جاتا ہے کہ باقی ماندہ دس اس کی لاش پر لگائے جائیں تاکہ حد پوری ہو۔ غور کیجیے، کیا انہیں محبّت پدری نہیں تھی؟ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ اتنی سزا کے برداشت کرنے کے وہ قابل نہیں ہے، پھر کون سی چیز تھی جو انہیں سزا دینے پر مجبور کر رہی تھی؟ وہی اسلام کی سادہ تعلیم جو ہر ایک فرد کو یکساں حقوق دیتی ہے۔ وہی انصاف جو کہ امیروں اور غریبوں کے لیے یکساں ہاتھ پھیلاتا ہے۔

اپنی حالت ملاحظہ کرو، ہاں جی ہاں کے سوا مُنہ سے کچھ اور نکلتا ہی نہیں۔ اگر بڑا آدمی یا حاکمِ وقت مُنہ سے کوئی لفظ نکالتا ہے تو ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سر خم کر دیتے ہو اور ''درست بجا ارشاد ہوا'' کی رٹ لگاتے رہتے ہو۔ ہمّت نہیں بندھتی کہ اس کے سراسر غلط فعل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔ حالانکہ تمہیں حق حاصل ہے کہ بلا روک ٹوک اس پر اعتراض کر سکتے ہو۔ اسلام تمہیں کیا ہی زرّیں اصول سکھلاتا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت بھی کوئی ایسا کام کرے جو تمہارے خیال کے مطابق درست نہیں تو تم اس کو فوراً روک سکتے ہو۔ اسی کا نام ہے آزادئ رائے، اسی کا نام ہے جمہوریت، اور اسی کا نام ہے مساوات۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے جس کے دوران میں آپؓ نے ارشاد کیا ''اے لوگو! سُنو! اور اس پر عمل کرو۔'' اسی میں ایک بدوی اُٹھا اور کہنے لگا۔ ''نہ سنیں گے اور نہ عمل کریں گے۔'' آپؓ نے حیران ہو کر فرمایا ''کیوں؟'' کہنے لگا، میں دیکھ رہا ہوں کہ یمن سے غنیمت میں جو چادریں آئی تھیں وہ حصّہ کے مطابق فی کس ایک آتی تھی۔ مگر اس چادر کا بنا ہوا کرتہ جو آپؓ زیب بدن کئے ہوئے ہیں ایک چادر میں نہیں بن سکتا۔ اس کا کیا سبب ہے؟'' آپؓ نے فرمایا، ''اس کا سبب میرے لڑکے عبداللہ سے معلوم کر لیا جائے۔'' چنانچہ عبداللہ ابن عمرؓ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے۔ ''جو چادر میرے حصّہ میں آئی تھی اُس میں سے نصف میں نے اپنے والد کو دے دی تھی۔ تب وہ بدوی کہنے لگا، ''اب سُنیں گے اور عمل کریں گے۔''

خلیفہ کا یہ کام تو نہیں کہ عیش و عشرت میں مدہوش رہے اور رعایا کے حالات تک کی اس کو خبر نہ ہو۔ خواہ اس پر طوفان آئے یا بربادہو جائے۔ آنحضرتؐ کے ہاتھ سے خلافت کی بنیاد اس لیے تو نہیں رکھی گئی تھی کہ ایک فرد واحد تمام عالم کو حلقۂ غلامی میں جکڑ کر فرعون، نمرود اور شدّاد کی طرح ان کی گردنیں اپنے آگے جھکوائے اور ان کے زر و مال اپنی خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے کے لیے خرچ کرتا رہے اس کا فرض ہے کہ رعایا کے

حالات پل بہ پل معلوم کرتا رہے۔اور حتیٰ الوسع اپنے اوقات اس کی فلاح و بہبودی میں صرف کرے۔ حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات کا غور سے مطالعہ کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اس جلیل القدر خلیفہ نے ان زرّیں اصولوں پر کس حد تک عملدار کیا، اور اپنی پاک زندگی میں کیا کیا کام رعایا کی بہتری اور بہبودی کے کئے۔ کیا انہوں نے محل سرا تعمیر کئے، کیا انہوں نے اپنی آسایش کے لیے باغات اور چمنستان لگوائے، کیا اپنی جان کو آرام پہنچانے کے لیے لونڈیوں اور غلاموں کا لشکر عظیم اکٹھا کیا، کیا اپنے اصطبلوں کو بیش قیمت گھوڑوں سے زینت دی، کیا اپنے محل اور گھروں کے گرد فوجوں کے پرے جمائے کہ انسان کی آواز ان کے کان تک نہ پہنچ سکے ؟ اگر ایسا نہیں کیا تو کیوں ؟ کیا وہ ایران، شام، عرب اور مصر کے شہنشاہ نہیں تھے، کیا ان کو ان تمام چیزوں کے مہیا کرنے کی استطاعت نہیں تھی ؟ یہ سب کچھ حاصل تھا، اگر وہ چاہتے تو ایک نہایت ہی جابر بادشاہ کی طرح سلطنت کرتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اصل میں خلیفہ قوم کا خادم ہے اور ملک کا مال رعایا کی ملکیت ہے۔

باہر سے مدینہ منورہ میں ایک قافلہ آتا ہے تو وہی شہنشاہِ اسلام گمنامی کی حیثیت میں اِدھر اُدھر اس کی حفاظت کے لیے پہرہ دیتا ہے، اور اچانک ایک طرف سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ اس کی والدہ کو ایک دفعہ دو دفعہ بلکہ تین دفعہ اُس کو چُپ کرانے کے لیے کہتے ہیں۔ آخر معلوم کرنے پر کہ وہ اس کے روزینہ کی خاطر دُودھ چھڑانے کی کوشش کرتی ہے اس لیے وہ معصوم چلاتا ہے تو نہایت رنج کے ساتھ کفِ افسوس ملتا ہے، اور حکم جاری کیا جاتا ہے کہ جس روز بچہ پیدا ہوا اسی روز اس کا روزینہ مقرر کر دیا جائے۔

ایک رات اپنے غلام کو ساتھ لے کر مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقام پر پہنچتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ایک عورت نے چولھے پر ہنڈیا رکھی ہوئی ہے اور بچے اس کے ارد گرد رو رہے ہیں، وہ ان کو تسلی دے رہی ہے۔ آپؓ بڑھ کر اس سے پوچھتے ہیں۔ وہ کہتی ہے، لڑکوں نے تین روز سے کچھ کھایا نہیں کیونکہ گھر میں کچھ ہی نہیں اس لیے ان کی تسلی کے لیے خالی ہنڈیا چولھے پر رکھی ہے تاکہ اس سے ان کی ڈھارس بندھی رہے۔ وہ سنتے ہی تھرا اٹھتے ہیں اور فوراً ہی بیت المال میں واپس آتے ہیں اور گوشت، آٹا، گھی، کھجوریں لے کر غلام سے فرماتے ہیں، ان چیزوں کو میری پیٹھ پر لاد دو۔ غلام عرض کرتا ہے، حضور میں لیے چلتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں اور کیا ہی خوب کہتے ہیں، ''تو مجھ کو ان کے اُٹھانے کے لیے کہتا ہے، لیکن کیا تو قیامت کے دن بھی میرا بار اُٹھائے گا۔'' جانتے ہو یہ کون ہے جو خود مزدوروں کا کام کر رہا ہے اور بجائے غلام کے خود ان تمام اشیاء کو اپنی پیٹھ پر لاد کر

لے جارہا ہے؟ یہ وہی خلیفۃ المسلمین سلطان البرّ والبحر ہے جس کی شکل سے بڑے بڑے خود سر بادشاہ کانپتے ہیں۔ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے، اس لیے کہ اسے خوفِ خُدا ہے۔ مبادا قیامت کے روز ان بے گناہوں کی فاقہ کشی سبب باز پرس ہو۔

ایک رات پھر اسی طرح گشت کرتے ہیں، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بدوی اپنے خیمہ کے باہر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے قریب ہی آپؓ بھی بیٹھ جاتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کرتے ہیں۔ اچانک اندر سے ایک عورت کے رونے کی آواز آتی ہے۔ آپ اس سے دریافت فرماتے ہیں۔ جواب ملتا ہے، میری عورت کے بچہ ہونے والا ہے اور وہ دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ فوراً واپس گھر جاتے ہیں، اپنی شہنشاہ بیگم نصف دنیا کے سلطان کی ملکہ کو ہمراہ وہاں لاتے ہیں اور بدوی سے اجازت لے کر اس کو اندر بھیجتے ہیں، اور خود اس کے پاس خیمہ سے باہر بیٹھ جاتے ہیں۔ ملکۂ جہان بدوی کی عورت کی خدمت کرتی ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کا روزینہ مقرر کر دیتے ہیں۔

اس طرح ایک اور رات حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کے گھر تشریف لے جاتے ہیں اور اُن سے فرماتے ہیں۔ ''مدینہ کے باہر ایک قافلہ آیا ہے، آؤ اس کی حفاظت کریں۔'' قحط پڑتا ہے تو وہ غرباء کے غم میں گھلے جاتے ہیں اور قریب ہے کہ اس غم میں جان دے دیں۔ غرضیکہ کیا کیا بیان کیا جائے۔ آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے خلافت کو کیا سمجھا تھا۔

خلافت سے پہلے آپ تجارت کیا کرتے تھے۔ جب خلافت کا بہت زیادہ بوجھ آپ کے سر پڑ گیا تو ایک دن صحابہؓ کو جمع کر کے آپ نے اپنی ضروریات ان کے سامنے پیش کیں اور کہا کہ بیت المال سے میں کس قدر اپنے اخراجات کے لیے لے سکتا ہوں۔ لوگوں نے مختلف رائیں دیں مگر حضرت علیؓ خاموش تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، آپ کیا اظہار رائے کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے، صرف معمولی درجہ کی خوراک اور لباس۔ چنانچہ بیت المال سے ان کے لیے اور ان کے بیوی بچوں کے لیے کھانا اور کپڑا مقرر ہو گیا۔ خیال کیجیے، اتنی بڑی مملکت کا شہنشاہ اور اس قدر معمولی خرچ گزارہ کے لیے ملتا ہے۔

اب وقت آگیا کہ آپ عالم بالا کی طرف تشریف لے جائیں۔ چنانچہ مرنے سے پیشتر آپ نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کو بلا کر ان سے کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ خلافت کے لیے آپ کو نامزد کروں۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے عرض کی۔ ''میں امیر المومنینؓ سے ہی رائے لیتا ہوں کہ آپ مجھ کو اس کا اہل سمجھتے ہیں۔'' آپ

نے فرمایا، اچھا میں تم سے اس معاملہ میں ایک کام لینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس خلافت کے بار کو ان پانچوں آدمیوں عثمانؓ، علیؓ، زبیر ابن العوامؓ، سعد ابی وقاصؓ، طلحہ ابن عبد الرحمنؓ میں سے کسی ایک کے سر پر ڈالوں کیونکہ ان سے آنحضرتؐ بہت خوش تھے۔ تم ان پانچوں کو بلاؤ اور کسی ایک کو چن لو۔ چنانچہ اس کے بعد ان پانچوں کو بلایا گیا مگر طلحہؓ کہیں باہر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''تم پانچوں میں سے کسی ایک کو خلافت دینا چاہتا ہوں۔ تم عبد الرحمنؓ ابن عوفؓ کے مشورہ سے آپس میں فیصلہ کر لو۔''

# چھٹی فصل

## خلافتِ غنیّہ

### آثار ضعف

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد پانچوں آدمیوں کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کے بعد فرمایا۔ ''عثمانؓ اگر تم کو خلافت ملے تو اپنے قرابت داروں کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ حقوق نہ دینا بلکہ سب کو برابر سمجھنا۔'' مگر افسوس حضرت عثمانؓ نے اس پر عمل نہ کیا اور اپنے خاندان والوں کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھنے کے بعد ان کو بڑے بڑے عہدے دیتے رہے۔ اپنے سالے مروان ابن الحکم کو جو کہ ابدی مفسد اور شریر تھا آپ نے اس قدر اپنے نزدیک رکھا کہ خلافت کے تمام کاروبار اسی کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے، اور آخر کار اسی شریر النفس، مفسدہ پرداز، مکار، روباہ خصلت، ازلی مردود کی کارستانیوں نے اس پاک باز، نیک نفس، سادہ مزاج، حیا اور ایمان کے پتلے اور حضورؐ کے یار کو ایسے طریقہ کے ساتھ قتل کروایا کہ اس کے بیان سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ ''اپنے قرابتیوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔'' حضرت عثمانؓ نے سمجھ رکھا تھا کہ اسی حکم کے مطابق مجھ پر فرض ہے کہ میں بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کروں حالانکہ اس قسم کا سلوک ان کو اپنی ذات سے کرنا چاہیے تھا نہ کہ سلطنت اور خلافت کے تمام حقوق ان کو ہی دے دینے تھے۔ خلافت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے، یہ تو عامۃ المسلمین کی ملک ہے، اس میں بیگانے اور یگانے یکساں ہیں۔ اس معاملہ میں انہوں نے سخت غلطی کی اور اس کے باعث انہیں آخر کار خمیازہ اٹھانا پڑا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ چونکہ سلطنت اسلامیہ نہایت ہی وسیع ہو گئی ہوئی تھی اور عربوں کا اقتدار تقریباً نصف دنیا پر قائم ہو گیا تھا اس لیے ضرورت تھی کہ خلافت کی باگ ایسے خلیفے کے ہاتھ میں ہو جو کہ اپنے اندر حضرت عمرؓ جیسا تدبر رکھتا ہو۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ انہوں نے اُن اُجڈ اور خود سر عربوں کو کس طرح ناک کی سیدھ چلایا اور ان کے غرور اور تکبّر کو کس طرح اپنی حیرت انگیز سیاست سے توڑ ڈالا کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کبھی سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ معاویہؓ اور عمرو ابن العاص جیسے ڈھنگی اشخاص بھی ان

سے تھر تھر کانپتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنے بعد خلیفہ کا نہایت ہی اعلیٰ انتخاب کیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اپنا جانشین کر گئے۔ پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ کا نہایت ہی عمدہ انتخاب ہوا۔ وہ ہر ایک معنی میں امت کی نگہبانی کے لیے نہایت ہی موزوں ثابت ہوئے۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چند ایک صحابہؓ سے حضرت عمرؓ کے متعلق استفسار کیا تو حضرت طلحہ نے کہا ''آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ کس قدر سختیاں کرتے ہیں اور آپ انہیں کو خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ آپ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا ''خدائے عزّوجل سے میں یہی کہوں گا کہ خلقت میں جو سب سے بہتر تھا اس کو خلیفہ مقرر کر کے آیا ہوں۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے زعم میں نہایت ہی اعلیٰ انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے واقعاتِ خلافت بھی ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے اپنی دس سالہ حکومت میں خلافت کے کاموں کو کس خوبی اور عمدگی سے انجام دیا۔ لیکن آپ کی آخری وصیّت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں آپ اپنے بعد کسی ایک میں بھی اس وسیع اسلامی سلطنت کے انتظام کی صلاحیت نہیں پاتے تھے اور اسی سبب سے آپ اکثر مغموم رہا کرتے تھے، اور اسی لیے آپ نے متذکرہ صدر پانچوں صحابیوں کو نامزد کیا کہ ان میں سے جس کو چاہنا خلیفہ بنالیتا۔ حضرت عثمانؓ کا نام آپ نے غالباً اسی لیے لیا تھا کہ آپ آنحضرتؐ کے داماد تھے۔ آپ کی دو صاحبزادیاں ان کے عقد میں تھیں اور ہمیشہ مسلمانوں کی امداد کے لیے بیدریغ زر و مال صرف کیا کرتے تھے، نہایت ہی عابد اور زاہد تھے۔ ورنہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عثمانؓ جیسا سادہ انسان سیاست اور تدبّر کے لیے کسی صورت موزوں نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ کرتے، تو کیا کرتے۔ ضرروت تو اس بات کی تھی کہ آپ کے بعد ایک ایسا جید خلیفہ ہونا چاہیے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ جیسی قوت ارادی اور حضرت عمرؓ جیسا رعب و داب رکھتا ہو۔

ان باتوں سے بھی در گزر کرتے ہوئے اگر آپ تاریخ طبری کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب بھی کچھ ایسے طریقہ کے ساتھ ہوا تھا جس کو ہم بے انصافی پر محمول کر سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے بے وجہ بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے اور اس دشمنی کو زیادہ وسعت دینے والے بنی امیّہ تھے جن کا ہمیشہ سے ہی بنی ہاشم کے ساتھ بغض و عناد رہا کرتا تھا۔ ابو سفیان جو کہ کفار مکہ میں سے آنحضرتؐ کے سب سے بڑے دشمن تھے، اب بھی باوجود اس بات کے کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ہوئے تھے، مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں چاہتے تھے چونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کہ سب سے آخر کوئی چارہ کار

نہ دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے ان کے اندر وہ بات نہیں پائی جاتی تھی جو کہ دوسرے صحابہؓ میں تھی۔ ان کے صاحبزادے معاویہؓ بھی ان کے ساتھ ہی اسلام لائے۔ (جن کا حال آپ آیندہ اوراق میں پورے طور سے ملاحظہ کریں گے کہ اسلام کی غارت گری کے انہوں نے کون کون سے ذرائع نکالے۔) اس کے ساتھ ہی چونکہ یہ لوگ نہایت ہی چالاک اور زمانہ ساز تھے، انہوں نے عمرو ابن العاص (فاتح مصر) جیسے مدبّر کو اپنے ساتھ گانٹھ کر حضرت علیؓ کے خلاف اپنی سیاسی تدابیر کو کامیاب بنانے کے لیے ان سے کام لیا۔ چنانچہ عمرو ابن العاص نے حضرت علیؓ کو ایسی پٹی پر چڑھایا کہ انتخاب کے وقت ان کے منہ سے کچھ کا کچھ کہلوا دیا (دیکھو تاریخ طبریؒ) اور اسی سبب سے وہ خلیفہ بننے سے رہ گئے، ورنہ ممکن تھا کہ حضرت علیؓ تخت خلافت پر متمکن ہوتے۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ آپ کو آپ کے دشمن پھر بھی آرام نہ لینے دیتے۔

ابو سفیان اور عمرو ابن العاص کی جدوجہد نے حضرت عثمانؓ (جو کہ بنی امیہ کے ایک رکن تھے) کو خلیفہ بنوا دیا، لیکن ان سے خلافت کے اہم امورات کی انجام دہی مشکل ثابت ہوئی۔ لیکن ہم یہ بھی کہنے کے لیے تیار ہیں کہ معاویہؓ اور اسی طرز کے دیگر لوگوں کی مدد سے جو کہ اس زمانہ میں سیاست دانی اور تدبیر ملکی میں طاق مانے ہوئے تھے اور جو کہ بسبب رشتہ قرابت کے آپ کے خیر خواہ بھی تھے۔

آپ نہایت ہی احسن طریقہ سے سلطنت کے کام سرانجام دے لیتے مگر آپ کے اس طرز عمل نے جس کا ذکر شروع فصل میں کیا گیا ہے اور جس کے باعث آپ نے مروان جیسے بدبخت آدمی کو خلافت میں بہت زیادہ دخل دیا ہوا تھا آپ کو آخر کار زک دی۔ ہم حیران ہیں کہ اس نامراد مروان کی بے قاعدگیاں بار بار آپ کے گوش گزار ہوا کرتی تھیں، اور آپ کو علم بھی تھا کہ اس کے سبب بہت زیادہ ناراضگی رعایا میں پھیل رہی ہے، مگر آپ اس کو کسی صورت میں ترک نہیں کرتے تھے، اور یہاں تک آپ نے اس پر بھروسہ کیا ہوا تھا کہ اپنی مہر بھی اس کے سپرد تھی جس سے وہ جس طرح چاہتا تھا الٹے سیدھے احکام آپ کے نام سے جاری کرتا، اور جن لوگوں کے ساتھ اس کو دشمنی تھی ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کا ذاتی طور سے کوئی بھی دشمن نہیں تھا۔ ان کی نیک نیتی اور زہد و اتقا نے کبھی بھی کسی کو ان کے خلاف ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ حیا اور ایمان کے پتلے تھے اور رعایا کا ہر ایک فرد ان سے محبت رکھتا تھا۔ لیکن جب ایک گروہ نے دیکھا کہ ان سے ظلم ہو رہا ہے (جو کہ اصل میں مروان کی حرام زدگیاں تھیں) تو وہ آپ کے مخالف ہو گیا کیونکہ اس کے خلاف امیر المومنین کے دستخط سے عجیب عجیب فرمان جاری ہونے لگے جو کہ اصل میں مروان کی کارستانیاں تھیں۔

تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ حضرت عثمانؓ سیاست میں بہت کمزور خلیفہ ہوئے ہیں۔ مگر یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی کمزور سیاست کے باعث سلطنت اسلامیہ کو کسی قسم کا ضعف پہنچا۔ حضرت عمرؓ کے عہد مبارک کی طرح ان کے زمانہ میں بھی فتح و ظفر کا سلسلہ جاری رہا اور طرابلس الغرب انہی کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں لایا گیا۔ اگر کوئی فساد ہوئے بھی تو وہ اندرون ملک میں تھے۔ غیر اقوام کو اسلام پر غلبہ حاصل کرنے کی اس وقت بھی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

جہاں تک واقعات پر نظر پڑتی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نہایت ہی نرم دل واقع ہوئے تھے اور انہیں بنی امیہ کا بہت زیادہ پاس تھا۔ افسوس اگر حضرت عمرؓ کی زندگی پر ذرا غور کرتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ دوسروں پر بنی امیہ اور خاص کر کے اپنے قرابت داروں کو ترجیح دینے سے کیسے کیسے بُرے نتائج پیدا ہوں گے۔ حضرت عمرؓ کے فوت ہونے کے وقت جبکہ آپ کو جانشین کی فکر لاحق تھی تو ایک شخص نے کہا۔ ''آپ اپنے لڑکے عبداللہ ابن عمرؓ کیوں نامزد نہیں کرتے۔'' آپ کا چہرۂ مبارک غصّے سے سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے۔ ''چپ رہ خدا تجھے غارت کرے۔ تو نے یہ بات مسلمانوں کے فائدے کے لیے نہیں کہی بلکہ مجھے خوش کرنا چاہا ہے۔ وہ شخص جو اپنی بیوی کے طلاق دینے میں ٹھیک فیصلہ نہ کر سکتا ہو مسلمانوں کا کیا خاک فیصلہ کرے گا۔'' اسی طرح جبکہ خلیفہ کے انتخاب کے مشورہ کے متعلق آپ نے چند ایک آدمی مقرر کیے تو کسی نے آپ کے قبیلہ عدی کے ایک شخص کا نام بھی لیا۔ اس پر آپ کہنے لگے۔ ''بس بنی عدی سے ایک آدمی کافی ہے اور وہ میں تھا کہ اپنا کام ختم کر چکا۔ خبر نہیں میرا ہی کیا حشر ہوگا۔ اب بنی عدی میں سے کسی کو لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کیا ایسی ایسی امثال حضرت عثمانؓ کے پیش نظر نہیں تھیں۔ افسوس ان کا نرم دل اور کمزور طبعیت ان کو ایسے کاموں سے نہ روک سکی جو کہ خلافت کے لیے مہلک اور خود ان کی ذات کے لیے نقصان دہ تھے۔ باوجود اس بات کے کہ فاروق اعظمؓ ان کو وصیّت بھی کر گئے تھے کہ اگر خلیفہ ہو گے تو اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کی رعایت نہ کرنا۔ لیکن قبیلہ بنی امیّہ کے شریر لوگوں نے انہیں اپنے قبضہ میں کر لیا اور ان کی خلافت سے خوب فائدے اٹھانے شروع کیے۔ یہ بات دوسرے قبیلوں کے صحابہؓ اور ان مستحق لوگوں کو ناگوار گزری جن کا حق بنی اُمیّہ کے غیر مستحق لوگوں کے سبب مارا جاتا تھا۔

حضرت عثمان ابن عفانؓ نے صوبوں کی گورنری اور علاقوں کی حکومت بنی امیہ میں مخصوص کر دی اور معاویہؓ کو شام کی ولایت پر اتنی ڈھیل دی تھی کہ ان سے کسی بات کی نسبت پرسش ہی نہیں ہوا کرتی تھی۔

چنانچہ امیر معاویہ نے یہ فائدہ اٹھایا کہ خود مختارانہ طور سے ملک شام میں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور ایسا غلبہ حاصل کیا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد خلافت کو فنا اور مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کے مقررہ کردہ صوبہ داروں اور حکام علاقجات کو معزول کرنا شروع کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بھانجے عبداللہ ابن سعد ابن سرح کو ایک بڑے صوبہ مصر کا والی کر دیا۔ حالانکہ وہ مرتد تھا جس کے قتل کا آنحضرتؐ نے حکم دے دیا تھا۔ یہ شخص نہایت ہی مغرور، مفسد اور بد باطن آدمی تھا۔ اس کی تقرری صحابہؓ کو بہت بُری معلوم ہوئی کیونکہ وہ اپنے آقا کے معتوب آدمی کو اس قسم کے معزز عہدے سے پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور مروان کو اپنا سیکرٹری (کاتب) بنایا۔

ان تبدیلیوں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضرت عثمانؓ کی سیاست کس قدر کمزور تھی۔ حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ صوبہ داروں کو معزول کرنا کس قدر غلط تھا۔ دنیا بھر کے مؤرخین کیا عیسائی اور کیا مسلمان اس بات کے قائل ہیں کہ جس قدر مردم شناسی کا جوہر حضرت عمرؓ میں پایا جاتا تھا اور کسی میں نہیں تھا۔ انہوں نے خلافت کی کل میں وہ پرزے موزوں کئے ہوئے تھے کہ عقل دنگ رہتی ہے۔ انہوں نے ایسی ایسی تدابیر سے اس وسیع مملکتِ اسلامی کا انتظام کیا تھا کہ ایک دنیا متحیّر ہے۔ وہ رشتہ داروں کو ملکی عہدے نہیں دیتے تھے کہ قرابت کے گھمنڈ میں ظلم کریں گے۔ معاویہؓ اور عمرو ابن العاصؓ سیاست میں مانے ہوئے تھے۔ انہیں صرف اس لیے بڑے بڑے عہدے دیئے کہ لوگوں کو قابو میں رکھیں گے۔ لیکن ان کو کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ان سے ذرا سی غفلت کی تو کچھ کا کچھ کر دیں گے۔ عمرو معدی کرب ایک نہایت ہی بہادر پہلوان تھے۔ اس کو حضرت عمرؓ ایک ہزار جوان کے برابر سمجھتے تھے لیکن انہیں کبھی بھی فوج میں اعلیٰ عہدہ نہیں دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ فوجوں کو نہیں لڑا سکتے۔ چنانچہ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جو لوگ بہت زیادہ صاحب اثر تھے ان کو دار الخلافہ سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک دفعہ ان لوگوں نے جہاد پر جانا چاہا تو آپ نے فرمایا۔ ''آپ لوگ یہ دولت بہت جمع کر چکے ہیں۔'' ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن ابن العوفؓ نے آپ سے کہا۔ ''آپ ہم لوگوں کو باہر جانے کیوں نہیں دیتے؟'' حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ''اس سوال کا جواب نہ دینا جواب دینے سے بہتر ہے۔''

غرضیکہ اس قسم کے ہزاروں امثال ہیں جو کہ حضرت عمرؓ کے تدبر کی نسبت بیان کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا اعادہ اس کتاب کے مطالب سے باہر ہے اس لیے صرف چند ایک کے ذکر پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ

ناظرین کو معلوم ہو کہ خلافت کے امورات کے انجام دینے کے لیے کس قسم کی قابلیت کی ضرورت ہے، اور حضرت عثمانؓ کی کمزور طبعیت اس کے لیے موزوں نہیں تھی۔ ہمیں چونکہ یہاں صرف یہی دکھلانا تھا کہ خلافت کیا ہے اور اس کے لیے کس قسم کا خلیفہ ہونا چاہیے، اور زیادہ تر خلفاء کے طرزِ عمل اور تدبّر اور سیاست پر بحث کرنا تھی اس لیے یہ خیال نہ کیا جائے کہ ایسے ایسے نیک طینت اور متقی خلفاء کی ذات پر کس قسم کا حملہ کیا جاتا ہے۔ فی زمانہ مسلمانوں میں جہاں تنزل اور انحطاط کے آثار رونما ہیں وہاں یہ بات بھی ان کے طبائع میں داخل ہے کہ اگر حقیقت کا انکشاف کیا جائے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ توبہ نعوذ باللہ! ہم حضرت عثمانؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ اور قابل تعظیم بزرگ کی شان مبارک میں کسی قسم کا گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالیں۔ بلکہ جو کچھ بھی اس وقت تک بیان کیا گیا ہے محض نیک نیتی سے ان کی خلافت پر تنقید کی ہے اور تاریخی حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ خلافت کے معاملہ میں ان کی سیاست کس درجہ درستی پر تھی، اور سلطنت کے کاروبار میں کہاں تک ان کا دخل تھا۔ ہم سچ کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے تنزل کو دیکھ کر ہماری آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں اور ہمیشہ سے یہی دلی تمنّا ہے، اور ان میں جو تفرقہ اور قومی ناچاقی ہے اگر دور ہو جائے تو شاید اللہ جل شانہ ان کے کام درست کر دے۔ ضد اور ہٹ نے مسلمانوں میں اس درجہ جگہ پکڑی ہوئی ہے کہ بلا سوچ وبچار لکیر کے فقیر چلے آتے ہیں اور حقیقت کا پردہ اٹھاتے ہی نہیں اور اگر کوئی بھولے سے راستی کی بات ان کے سامنے کرتا بھی ہے تو اس سے بگڑ کر کفر والحاد کے فتوے اس پر جڑتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم دن بدن کمزور ہو رہے ہیں اور تفرقہ پردازی ترقی کر رہی ہے۔ اس خلافت کے معاملہ نے ہم میں نااتفاقی ڈالی اور اسی سے ہماری متحدہ قومیت کو نقصان پہنچا۔ اگر اس معاملہ میں شروع سے لے کر آخر تک حقیقت کھول دی جائے اور مخالفین کی تسلی و تشفی ہو جائے تو ممکن ہے کہ اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ ایک جگہ پھر جمع ہو جائے۔

خیر یہ تو کچھ اور بات ہے۔ اس کے متعلق آیندہ دیکھا جائے گا۔ لیکن یہاں تو اس امر کا ظاہر کرنا ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد صرف معمولی سا اختلاف امت میں واقع ہوا تھا جو کہ بہت جلدی رفع ہو گیا اور جس کا پھر کسی کو سان گمان بھی نہ رہا۔ اور حضرت عمرؓ کی خلافت نے تو خود سر اور مفسد لوگوں کی خواہشات نفسانی کو دبا دیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ کی کمزوری اور بے جا طرف داری نے ایک نیا فتنہ پیدا کرنے کے ساتھ ہی ان لوگوں کو سر اٹھانے کی جرات دلائی جو کہ حرص و آز کے بندے تھے۔ ان کو اپنے پرانے انتقام لینے کے مواقع مل گئے اور قدیم قومی بغض و عناد کو از سرِ نو زندہ کرنے کا اتفاق ہو گیا۔ اگر حضرت عثمانؓ کی پالیسی ایک جید خلیفہ جیسی ہوتی

تو کبھی ممکن نہیں تھا کہ وہ تفرقے اور فسادات جو کہ آپ کی شہادت کے بعد دیکھنے میں آئے، کبھی وقوع پذیر نہ ہوتے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اسلام میں ایسی ایسی خونریزیاں کیں کبھی بھی اس قسم کے جرائم کے مرتکب نہ ہوتے۔ آپ کی کمزوری اور سادگی طبعیت کے باعث وہی مروان جو کہ آپ کا دست و بازو بنا ہوا تھا آپ کی شہادت کا باعث ہوا، اور وہ بھی اس طرح سے کہ اس کے بیان سے قلم کانپتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اور باغیوں کی نسبت ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ حضرت عثمانؓ بالکل معذور تھے کیونکہ انہوں نے باغیوں کو برانگیختہ نہیں کیا تھا۔ باغی بھی معذور تھے کیونکہ ان کے پاس حضرت عثمانؓ کے قتل کی سند تھی جو کہ اس مفسد مروان کی کارستانیوں کا نتیجہ تھی۔ افسوس کے ساتھ بار بار کہنا پڑتا ہے کہ خلیفہ ثالث اس قدر سیاست اور تدبّر سے دُور پڑے ہوئے تھے کہ دم بدم وہ کچھ کر گزرتے تھے جو کہ سراسر انتظامِ مملکت کے منافی تھا۔ ابوذرؓ بڑے نامی گرامی صحابی تھے۔ ان کو عثمانؓ کی خلافت میں شام کی سپہ سالاری حاصل تھی۔ معاویہؓ چونکہ نہایت ہی عیش پسند شخص تھا اور ارکانِ اسلام کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا اس لیے حضرت ابوذرؓ ہر جگہ معاویہؓ کو خلاف شرع کام کرنے پر ٹوک دیا کرتے تھے۔ معاویہؓ نے تنگ آکر حضرت عثمانؓ کو لکھا۔ آپ نے چہ جائیکہ دونوں کو سمجھاتے ابوذرؓ کو واپس بلا لیا۔ انہیں اپنی راست بازی پر بڑا بھروسہ تھا اور آنحضرتؐ کی صحبت کا لطف اٹھائے ہوئے تھے جو کہ ان کے ناز اُٹھایا کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے خیال کیا کہ میری بات کا خلیفۃ المسلمین پاس رکھیں گے، لیکن حضرت عثمانؓ نے اُلٹا ان سے شکوہ کیا کہ آپ نے خواہ مخواہ معاویہ سے اس قسم کا سلوک کیا۔ وہ نہایت ہی رنجیدہ خاطر ہو کر گوشہ نشین ہو گئے، اور دیگر صحابہؓ بھی جو کہ آنحضرتؐ کے محبوب تھے اس بات سے حضرت عثمانؓ سے ناراض ہو گئے۔ اس کے علاوہ آپ کی غفلت نے ایک اور گل کھلایا یعنی کہ رسول اللہؐ کی انگوٹھی گم ہو گئی جس سے لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ خدا اور رسولؐ کو ان کی خلافت منظور نہیں۔

مصر میں ان کا بھانجا عبد اللہ ابن سعد حاکم تھا۔ ایک جنگ میں اس نے جلیل القدر صحابہؓ کی توہین کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم لوگ لڑائی کے فن سے ناواقف ہو۔ انہیں غصّہ آیا اور کہا کہ مدینہ چل کر حضرت عثمانؓ سے خلافت چھین کر حضرت علیؓ کو دے دی، چنانچہ وہ وہاں آئے۔ اُدھر عبد اللہ نے بھی آپ کو خبر کی۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو آپؓ نے حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ کو مدد کے لیے بُلایا۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ ''ابو بکر صدیقؓ اور عمرؓ نے بیت المال کو محفوظ رکھا اور غیر مستحقین کو چھونے تک نہیں دیا، لیکن آپؓ نے اپنے اقرباء اور رشتہ داروں میں بانٹ دیا۔ آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ ''بے شک میں نے ان کو مفلس اور نادار

سمجھ کر دیا۔ ''حضرت علیؓ نے کہا۔ ''اگر مفلس جان کر دیا تو اس قدر گراں رقوم دینے سے کیا فائدہ تھا۔'' اس پر آپ نے فرمایا۔ ''میں اپنی گرہ سے یہ رقم خزانہ عامرہ میں ڈال دیتا ہوں۔'' ملاحظہ کیجیے، آپ کی کمزوری۔ انہیں دیتی دفعہ خیال نہیں فرماتے اور بعد میں اس بات سے پچھتاتے ہیں۔ خیر جب وہی مفسد لوگ مدینہ کی طرف حضرت عثمانؓ کو معزول کرنے کے لیے آئے تو حضرت علیؓ کی کوششوں سے ٹل گئے۔ لیکن مروان ابن الحکم (ازلی مردود) نے ان کو بہت سخت سُست کہا۔ حالانکہ وہ لوگ حضرت عثمانؓ کے درِ دولت پر چند ایک مطالبات لے کر دوبارہ حاضر ہوئے تھے۔ اس کے جب بعد پھر حضرت علیؓ نے سنا کہ باوجود میری کوششوں کے اس اُٹھتی آگ پر پانی ڈالا گیا ہے، مروان نے پھر حرامزدگی کی ہے، تو آپ نہایت ہی طیش میں آئے اور حضرت عثمانؓ سے کہا، ''آپؓ کو کیا ہو گیا ہے۔ جو چاہتا ہے آپ کی مہار اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ میں نے آپ سے بار بار کہا ہے کہ مروان آپ کو کنوئیں میں پھینک کر رہے گا۔ لیجیے، اب میرا آخری سلام ہے۔ اس کے بعد میں آپ کے مکان پر کبھی بھی نہیں آوں گا۔'' یہ کہہ کر آپ تشریف لے گئے۔ آپ کی تشریف بری کے بعد حضرت عثمانؓ کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہؓ نے کہا۔ ''حضرت علیؓ سے بگاڑ نہ کریئے، ان کا لوگوں پر بہت زیادہ اثر ہے، وہ تمام فسادوں کو دُور کر دیں گے۔'' چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو پھر بُلا بھیجا لیکن انہوں نے آنے سے انکار کیا، اور کہلا بھیجا کہ میں نے آپ کے گھر نہ آنے کی قسم کھائی ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ خود بدولت ان کے گھر تشریف لائے اور کہا ''اے ابوالحسن! مجھ کو دشمنوں میں اکیلا نہ چھوڑ۔ میں تیرے دامن کے نیچے پناہ لینے آیا ہوں۔'' حضرت علیؓ بولے، آپ مروان کے کہنے پر عمل کرتے ہیں اور وہ آپ سے برائی کرتا ہے۔ آپ اس کو الگ کر دیجیے ورنہ میں دخل نہیں دے سکتا۔ حضرت عثمانؓ یہ سن کر رنجیدہ خطر ہوئے اور واپس چلے گئے۔

اب وقت آ گیا کہ حضرت عثمانؓ کی غلط تدبیریں ان کی جان لیں۔ وہی لوگ جنہیں حضرت علیؓ نے سمجھا کر واپس کر دیا تھا پھر جاتے ہوئے ایک شتر سوار سے ملے۔ انہوں نے اس کی تلاشی لی تو حضرت عثمانؓ کی مہر کا انہیں ایک خط اس کے پاس سے ملا جس میں لکھا تھا، جب یہ لوگ مصر آئیں تو ان کو فوراً قتل کر دینا۔ جونہی انہوں نے یہ دیکھا تو واپس مدینہ ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، اور انہیں یہ خط دکھلایا۔ آپ نے انکار کیا اور کہا کہ میں نے یہ نہیں کہا، البتہ مہر میری ہے۔ انہوں نے کہا آپ کی یہ اور غلطی ہے کہ آپ اپنی مہر کی حفاظت نہیں کرتے۔ خیر ہم سمجھ گئے ہیں کہ یہ مروان کا کام ہے، آپ اس کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔'' لیکن پھر آپ

نے اس کے دینے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں نے زور پکڑا اور چند یوم کے محاصرہ کے بعد آپ کے گھر گھس کر آپ کو اس وقت جبکہ تلاوتِ قرآن مجید کر رہے تھے قتل کر دیا۔ افسوس وہ بے گناہ تھے لیکن آپ کے شریر رشتہ داروں اور نزدیکیوں نے آپ کو یہ دن دکھلایا۔

ناظرین نے حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت کو ملاحظہ کر لیا ہو گا۔ ہم انہی کی رائے پر چھوڑتے ہیں کہ بدیں واقعات حضرت عثمانؓ کا زمانہ کس قدر شاندار تھا۔ آپ کی سیاسی غلطیوں نے خلافت کی کیا دُرگت بنائی، اور یہاں پر ہی بس نہیں ہوا کہ آپ خود ان غلطیوں کا شکار ہو گئے بلکہ آیندہ کے لیے اسلام کو بہت کچھ مصائب کا سامنا کرنا پڑا جو کہ اب تک بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ بعض کج فہم اور دنیا پرست لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو جُدا چیزیں ہیں۔ کیا حضرت عثمانؓ میں مذہب نہیں تھا؟ پھر کیوں ان کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ سیاست کی کمی تھی۔

# ساتویں فصل

## خلافتِ حیدریہ

## بغاوتِ معاویہ

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کئی روز تک کوئی خلیفہ نہ ہوا۔ آخر کار مصر کے لوگ حضرت علیؓ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ آپ ہی اُمّت کی دستگیری کا ذمہ لیں۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ میں اس بار کو نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ لوگوں میں اختلاف ہو رہا ہے۔ کوفہ کے لوگ حضرت زبیر ابن العوامؓ کی خلافت چاہتے ہیں۔ بصرہ کی خلقت طلحہؓ کی خلافت پر رضامند ہے، اس حالت میں جلدی نہیں چاہیے۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے اس معاملہ میں جلدی نہیں کی اس طرح تم بھی مت کرو اور پورے غور و حوض کے بعد اس کام کو انجام دو۔ آخر کار نہایت رد و قدح کے بعد رسول اللہؐ کے یار اور چچازاد برادر، فاطمہ الزہرا کے شوہر، حسن و حسینؑ کے والد بزرگوار، اہلبیت کے سردار اور اُمّت کے مربّی بہ اتفاق رائے خلیفہ منتخب کئے گئے۔ یہ وہ حیرت انگیز انسان تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کے زمانہ میں بڑی بڑی معرکہ آرائیاں کر کے کفارانِ عرب کو خلیفہ بگوشِ اسلام کیا تھا۔ یہ وہ شیر پیشۂ شجاعت تھے جن کی تلوار کے آگے بڑے بڑے مردِ میدان نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان کی شان میں فرمایا تھا۔ ''یا اللہ یہ میری اہلبیت سے ہیں۔ جو ان سے محبّت کرے تو اس سے محبّت کر، اور جو ان کو دشمن رکھے تو اس کو دشمن رکھ۔'' غور کیجیے، یہ کیسا کلمہ ہے۔ اسی میں ایک زریّں اصول قائم کر دیا کہ ہر ایک مسلمان پر فرض ہو گیا کہ ان کے ساتھ محبّت کرے، اور جو انہیں بلاوجہ تکلیف دے اس سے دشمنی رکھے۔ گویا کہ ان سے دشمنی کرنے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل الزام ہے اور اس کی رحمت سے محروم ہے۔

حضرت علیؓ نے ہمیشہ حق کی حمایت کی تھی اور کسی صورت بھی حق کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ وہ اسلام کے سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی میں اپنی جان تک سے دریغ نہیں کیا کرتے تھے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بنی امیّہ اور بنی ہاشم کے درمیان ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی۔ آنحضرتؐ بنی ہاشم

میں سے تھے اور معاویہ ابن سفیان بنی امیہ میں سے۔ ان میں ہمیشہ سے رقابت تھی اور اس رقابت اور دشمنی کو معاویہ جیسے خود غرض اور حریص شخص نے اور زیادہ وسعت دی ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ معاویہ اور ان کے والد ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے برضاؤ رغبت اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ سب سے آخر مجبور ہو کر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ عرب کی حالتِ مزبوحی قبل از بعثتِ سرور کائناتؐ آپ کو معلوم ہی ہے۔ مختلف قبائل ایک دوسرے کے ساتھ کٹ کٹ کر مرتے تھے لیکن آنحضرتؐ کے ظہور نے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا تھا، اور آپس میں بھائی بھائی ہو گئے تھے۔ لیکن بنی امیّہ والے ہی ایک ایسے لوگ تھے جن کو بنی ہاشم اور آنحضرتؐ کے اہل بیت کی فضلیت کسی صُورت گوارا نہیں تھی۔ یہ لوگ اہلبیت کے جانی دشمن تھے اور ان سے پرلے درجہ کا کینہ اور عناد رکھتے تھے۔ معاویہ بلاشُبہ آنحضرتؐ کے صحابی تھے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا ظاہر اور باطن ایک جیسا نہیں تھا۔ ان کو ہر وقت یہی خیال رہتا تھا کہ کس طرح تمام مسلمانوں کو اپنے حلقۂ غلامی میں لایا جائے۔

کسی منصب کے حاصل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ امیدوار میں چند ایک قابلیتیں ہوں۔ خلافت چونکہ ایک نہایت ہی اہم ذمہ داری کا منصب تھا اس لیے لازمی بات تھی کہ خلیفہ ایک نہایت شاندار شخصیت رکھتا ہو، اس کو آنحضرتؐ سے خاص لگاؤ ہو، اس نے اسلام کی بہت بہت خدمات کی ہوں، مسلمانوں پر سے جان نثاری کا جوہر اس میں موجود ہو، اپنی جان و مال سے اسلام کے رستہ میں دریغ نہ کرتا ہو، راسخ الاعتقاد ہو، ہوا و حرص کا بندہ نہ ہو، اپنے ذاتی کاموں کا عامۃ المسلمین کے کاموں پر ترجیح نہ دیتا ہو۔ اس کے علاوہ ہر ایک بات میں دوسروں کے لیے نمونہ ہو۔ آپ غور کر سکتے ہیں کہ ان باتوں میں سے کونسی باتیں حضرت علیؓ سے زیادہ معاویہ میں پائی جاتی تھیں۔ وہ سب سے آخر مسلمان ہوئے۔ ان کا ہر ایک فعل ظاہر کرتا ہے کہ ہمیشہ ذاتی مفاد کو سب سے مقدم رکھا کرتے۔ خاص آنحضرتؐ کے اہلبیت کے دشمن تھے۔ ان کی زندگی کے بعد کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ انہیں اسلام سے کسی قسم کی محبّت نہیں تھی۔ وہ جلیل القدر صحابہؓ جنہوں نے آنحضرتؐ پر سے جانیں قربان کی تھیں ابھی تک موجود تھے، اور ان کے ہوتے ہوئے کس طرح ہو سکتا تھا کہ معاویہ جو کہ اسلام میں سب سے آخر درجہ رکھتے تھے، خلیفہ اسلام ہو سکتے۔ اور لطف یہ ہے کہ جب کبھی خلیفہ کے انتخاب کے متعلق سوال اُٹھتا تو ان کا نام تک کیا کبھی ذکر تک بھی کسی کی زبان پر نہ ہوتا۔ اور پھر ان کو خلیفہ بننے کا دعویٰ تھا۔ آخر ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے لیے ان میں کونسی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ ان کی آیندہ زندگی تو

ظاہر کرتی ہے کہ ابھی تک ان کا ایمان بھی راسخ نہیں ہوا تھا۔ تو پھر بھلا کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے امیر بنتے اور سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ جس کو غالب رائے سے مسلمان خلیفہ منتخب کر لیں وہ خلیفہ ہونے کا مستحق ہے۔ اور اگر کوئی شخص باقاعدہ خلیفہ ہونے کے بعد خلافت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ گویا باغی ہے اور باغی کی سزا قتل ہے۔ کیا حضرت علیؓ عامۃ المسلمین کے مشورہ سے خلیفہ منتخب نہیں ہوئے تھے؟ کیا سب لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت نہیں کی تھی؟ پھر یہ کہنا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ نے زبردستی اور مجبوراً بیعت کی تھی کس قدر لغو اور بیہودہ بات ہے۔ کیا اسلام نے ان کو اظہار رائے کی آزادی نہیں دی تھی؟ کیا ان کو اپنی رائے کے اظہار سے کوئی روک سکتا تھا؟ اگر ان پر کوئی زبردستی کرنے والا تھا تو وہ دباؤ میں ہر گز نہ آتے اور اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا معاویہ کے قسم کی ان ہستیوں کا کام تھا جو کہ مفسد تھے اور چاہتے تھے کہ اپنا اُلّو سیدھا کریں۔ افسوس ہے کہ اس قسم کے لوگوں نے اسلام کو اس قدر کمزور کیا کہ وہ بے چارہ اس کا خمیازہ اب تک بھگت رہا ہے۔ ان لوگوں کا اسلام لانے سے نہ لانا ہی بہتر تھا کیونکہ مسلمان ہو کر وہ اس کے لیے وبال ہی ثابت ہوئے۔

ہمیشہ قاعدہ ہے کہ جو شخص خود غرض ہوتا ہے وہ اپنی غرض پورا کرنے کے لیے اپنے رشتہ داروں اور قرابت والوں کو بھی بُھول جاتا ہے، اور اسی دُھن میں رہتا ہے کہ کسی صورت مطلب حاصل ہو۔ جب حضرت عثمانؓ کے درپے باغی ہو رہے تھے تو آپ نے بار بار ان کے خلاف کمک کے لیے معاویہ کو شام میں لکھا مگر کوئی مدد نہ پہنچی، اور وہ مظلوم خلیفہ قتل کئے گئے۔ اب جبکہ حضرت علیؓ ان کے بعد باتفاق رائے خلیفہ ہو گئے تو معاویہ کو اپنا مطلب برلانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے شام میں لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا اور حضرت عثمانؓ کا خون آلودہ کرتہ حضرت منبر پر چڑھ کر لوگوں کو دکھلاتے اور ان کو یقین دلاتے کہ حضرت علیؓ کی ہی سازش سے حضرت عثمانؓ قتل ہوئے، حالانکہ ناظرین گذشتہ فصل میں واقعہ قتلِ عثمانؓ ملاحظہ کر کے دیکھ چکے ہیں کہ بغاوت کے دُور کرنے میں حضرت علیؓ کی کس قدر کوشش تھی۔ اُنہوں نے اپنے فرزندوں (حسنؓ و حسینؓ) کو حضرت عثمانؓ کے درِ دولت پر حفاظت کے لیے تعینات کیا ہوا تھا اور ان سے تاکیداً کہا تھا کہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دی جائے، اور اگر کوئی زبردستی جانا چاہے تو خود اپنی جان دے دیں، لیکن باوجود اس کے معاویہ لوگوں سے کہتے کہ عثمانؓ بے گناہ تھے، اور حضرت علیؓ نے لوگوں کو بھڑکا کر ان کے خلاف کر دیا تھا، اور خلافت کے حاصل

کرنے کے لیے ان کو قتل کروایا۔ جب ہر روز ان کا یہی حال رہا کہ ہزاروں کے مجمع میں یہ واقع دوہرایا جاتا تو لوگ چونکہ مدینہ منورہ سے ہزاروں کوس دُور پڑے ہوئے تھے اور اصل واقعہ سے محض ناواقف تھے، ایسی ایسی باتوں کے سبب ان کے داؤ میں آ گئے اور حضرت علیؓ کے خلاف مرنے مارنے پر پل پڑے۔

ہم نے پیشتر بھی کسی جگہ کہا ہے کہ اس زمانہ میں معاویہ عرب میں اعلیٰ درجہ کے مدبّر مانے ہوئے تھے۔ وہ واقعہِ شہادت عثمانؓ اس طریقہ کے ساتھ بیان کرتے کہ لوگوں کو رقت طاری ہو جاتی اور زار زار رونے لگتے۔ اصل میں جیسا کہ بعد میں واقعات ثابت کریں گے، انہیں قتل حضرت عثمانؓ کے انتقام میں کچھ سروکار نہیں تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ خلافت میں گڑبڑی پڑے اور لوگوں کا میلان میری طرف ہو جائے، جن کی مدد سے حضرت علیؓ کو نیچا دکھلا کر خلافت غصب کر لوں۔ غور کیجیے، اور انصاف کی نظر سے دیکھیے، اگر انہیں حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام لینا تھا تو اس کی یہی صورت ہو سکتی تھی کہ ان لوگوں کو جو کہ حضرت علیؓ کی رعایا تھے خلیفۂ وقت کے خلاف بھڑکایا جائے، اور ایک باغی کی حیثیت میں مفسدوں کے ساتھ مل کر جنگی بدامنی پھیلائی جائے۔ اگر انہیں انتقام ہی لینا تھا تو وہ اس آزاد مسلمان کی طرح جس کو حق حاصل ہے کہ خلیفہ کے قول اور فعل پر آزادانہ طور سے نکتہ چینی کر سکتا ہے، مدینہ میں آتے اور برملا حضرت علیؓ کے خلاف آواز بلند کرتے، اور ان سے اس کے متعلق باضابطہ طور سے سوال کرتے کہ وہ ان کے شکوک حضرت عثمانؓ کے قتل کی نسبت رفع کریں نہ کہ یہ طرزِ عمل اختیار کرتے جو کہ سراسر قانون کے منافی تھا۔ واقعات پر غور فرمائیے اور پھر نتیجہ نکالیے۔ جو کچھ معاویہ کر رہے تھے کس حد تک حق بجانب تھا۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ان کے اس قسم کے طرزِ عمل سے اسلام کا کیا حشر ہونے والا تھا؟ وہ لوگ جو خواہ مخواہ معاویہ کی طرف داری کا دم بھرتے ہیں اور اُن کی حمایت میں کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر بے جا نکتہ چینی کرتے ہیں، تاریخی واقعات کو ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ حضرت علیؓ نے کونسا ایسا فعل کیا تھا جس کے سبب معاویہ کو ان پر ترجیح دی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ بات تھی کہ حضرت علیؓ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے تھے اور ہر ایک کام کو اسی کی طرف رجوع کرتے۔ لیکن برعکس اس کے معاویہ مکر و فریب سے کام لیتے اور اپنے مطالب کے حاصل کرنے کے لیے ان باتوں کو جائز قرار دیتے۔ اُدھر شام میں معاویہ یہ کارستانیاں کر رہے تھے، اِدھر سرزمین عرب کا حال سُنیے۔ معاویہ کے وہ چیلے جو مدینہ منورہ میں تھے اور حضرت علیؓ کے مخالف تھے آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکا رہے تھے اور اپنی ریشہ دوانیوں کو زیادہ وسعت دینے کے لیے مکہ معظمہ کی طرف چلے گئے تاکہ حضرت عائشہؓ زوجۂ مطہرہ سرورِ کائناتؐ کی

خدمت میں حاضر ہو کر نون مرچ لگا کر واقعۂ شہادتِ عثمانؓ ان کے سامنے پیش کریں۔ اتفاق کی بات جب یہ لوگ اس طرف سے جا رہے تھے تو حضرت عائشہ صدیقہؓ مکہ سے مدینہ کی طرف تشریف لا رہی تھیں، چنانچہ راستہ میں ہی ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ایسے پُر سوز طریقہ میں واقعۂ قتل کو آپؓ کے سامنے پیش کیا کہ آپؓ بھی برانگیختہ ہو گئیں (ان لوگوں میں طلحہؓ اور زبیرؓ بھی تھے، جنہوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کر لی ہوئی تھی) اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام لینے پر آمادہ ہو گئیں۔ انہیں اصل واقعات کی کیا خبر تھی۔ وہ عورت ذات تھیں، جو کچھ انہیں کہا گیا اس پر انہیں یقین آ گیا۔ چنانچہ سُننے کے ساتھ ہی آپؓ مکہ معظمہ کی طرف لوٹ گئیں تاکہ وہاں حضرت علیؓ کے خلاف جنگ کی تیاریاں کی جائیں۔ جب آپؓ مفسد لوگوں کے ساتھ مکہ معظمہ میں وارد ہوئیں تو انہوں نے مکہ والوں کو حضرت علیؓ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ لوگوں نے جب سُنا کہ آنحضرتؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام حضرت علیؓ سے لینے کے لیے تیار ہیں تو وہ بھی ان سے مل گئے، اور اس محبّت اور عقیدت کے باعث جو کہ اُن کو بہ سبب آپؓ کے منصب جلیلہ کے حضرت عائشہ کے ساتھ تھی، آپؓ کی حمایت پر کھڑے ہو گئے۔ افسوس معاویہ اور ان کے ایسے لوگوں کی کارستانیوں نے کیا کیا گل کھلائے اور اسلام کی تباہی اور بربادی کے کیسے کیسے منصوبے باندھے۔

اس مکّی سازش کے سرغنے طلحہؓ اور زبیرؓ تھے۔ یہ ان جلیل القدر صحابہؓ میں سے تھے جن کے آنحضرتؐ نے بڑے بڑے مناقب بیان کیے اور انہیں دنیا میں ہی بہشت کی بشارت دی تھی۔ خدا جانے ان لوگوں کے خیالات کو کیا ہو گیا۔ آنحضرتؐ کی صحبت حاصل ہونے کے باوجود وہ لوگ آپؐ کے اہلبیت اور عزیزوں کے خلاف اس قدر قابل اعتراض افعال کے مرتکب ہو رہے تھے کہ ان کی ذات سے کبھی بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

جب یہاں تک نوبت پہنچی تو انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو فریب دے کر یہ کہا کہ اب آپ خود چل کر لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے انتقام کے لیے اُبھاریں۔ اور طلحہؓ اور زبیرؓ نے کہا کہ آپؓ وہاں لوگوں کو کھڑا کر کے پھر آرام فرمائیں، ہم خود نپٹ لیں گے۔ یہ کیا تھا، صرف خود غرضی۔ اس سے بھی بڑھ کر اس بات پر غور کیجیے، جب حضرت عائشہؓ مکہ سے ایک منزل باہر تشریف لائیں تو حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ نے طلحہؓ اور زبیرؓ سے خفیہ طور پر سے ملاقات کی اور پوچھا، اگر تمہاری فتح ہوئی تو خلیفہ کون ہو گا؟ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا، میں یا زبیرؓ، ان میں سے مسلمان جس کو پسند کریں۔ مغیرہؓ نے سُن کر کہا "اس کام کا انجام اچھا نظر نہیں آتا"۔ یہ کہا اور مکّے

کو اُلٹے چلے گئے۔ یہ تھا واقعہ اور یہ تھے لوگ جو حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے جا رہے تھے۔ حضرت معاویہ یہ اپنی پیچ پر لگے ہوئے تھے اور خلافت کے غصب کرنے کے درپے تھے، اور اِدھر یہ لوگ خود خلافت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو آنحضرتؐ کی صحبت حاصل تھی اور پھر یہ حال تھا کہ حرص و آز میں مبتلا تھے۔ ہم ان کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے اندرونی بھیدوں سے خدائے عزوجل ہی واقف ہے۔ اگر ایک طرف ان کی بزرگی کی طرف دیکھا جائے تو کچھ کا کچھ خیال ہوتا ہے، اور اگر دوسری طرف ان واقعات پر غور کیا جائے تو افسوس آتا ہے۔ طبعیت عجب کشمکش میں مبتلا ہے۔ کریں تو کیا کریں؟

جب حضرت عائشہؓ کا قافلہ آگے جا رہا تھا تو ایک مقام حوّاب نامی آیا۔ وہاں کتوں نے حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر بھونکنا شروع کیا۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا، اس کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا حوّاب۔ آپ نے سنتے ہی فرمایا، طلحہؓ اور زبیرؓ کو بلا لاؤ، میں واپس جاتی ہوں کیونکہ آپ کو آنحضرتؐ کی وہ حدیث یاد آگئی تھی جس میں آپ نے فرمایا تھا۔ ''میری بیویوں میں سے ایک پر حوّاب کے کتّے بھونکیں گے کیونکہ وہ ناحق پر ہو گی۔'' جب طلحہؓ اور زبیرؓ نے سُنا کہ کام بگڑتا ہے تو فوراً کہنے لگے کہ یہ وہ مقام نہیں، رہبر نے غلطی سے یہ نام لے لیا ہے۔ لیکن آپؓ نے اصرار کر کے کہا کہ میں عورت ہوں، مجھے لڑائی سے کیا کام، مجھے گھر جانے دو۔ لوگوں نے دیکھا کہ اب آپ کسی طرح راضی نہیں ہوتیں تو لڑائی کا طبل بجا دیا کہ علیؓ کی فوج آگئی۔ یہ سن کر آپ بھی خاموش ہو گئیں (ملاحظہ ہو طبریؒ)۔ اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ معاویہ اور ان کے شرکاء غیر حق پر تھے اور محض اپنی نفسانی خواہشات اور اغراضِ ذاتی کے حصول کے لیے ایسی ایسی ابتریاں اور رخنے اسلام میں ڈال رہے تھے۔ خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس واقعہ کی نسبت پیشگوئی کی تھی، اور ان لوگوں کو جو حضرت علیؓ سے ناحق الجھ رہے تھے غلطی پر محمول کیا تھا۔ اب ہم اگر مسلمانوں کی حالت اور اُن لوگوں کے طرزِ عمل پر افسوس نہ کریں تو کیا کریں۔ انہوں نے اسلام سے کونسی محبّت کی تھی کہ ان کا لحاظ رکھا جائے۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ ناحق بے گناہوں کو خراب کر کے اپنے اغراض پورے کرتے تھے۔

اب حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قافلہ بصرہ پہنچ گیا۔ جب ان کی تشریف آوری کی خبر شہر میں پھیلی تو عجیب حالت ہوئی۔ کوئی حضرت علیؓ کو حق پر کہتا اور کوئی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حمایت ضروری سمجھتا۔ چونکہ حضرت عثمانؓ ابن حنیفؓ جو کہ حضرت علیؓ کی طرف سے بصرہ کے حاکم مقرر کیے گئے تھے، حضرت علیؓ کی بیعت توڑنے

اور آپ کی نافرمانی کرنے سے انکاری تھے، اس لیے حضرت عائشہؓ کے ہمراہیوں نے ان کی ڈاڑھی نوچ ڈالی۔ جب انہوں نے اپنی اس قسم کی توہین دیکھی تو سیدھے مدینہ منورہ کی طرف تشریف لے گئے اور تمام واقعات حضرت علیؓ کی خدمتِ مبارک میں بیان کیے۔ حضرت علیؓ کو اس بات پر بہت زیادہ غصّہ آیا اور آخر کار حق کی حمایت پر کھڑے ہو کر فوج کو کوچ کا حکم دیا اور بصرہ پر لڑائی کا نقشہ جم گیا۔ ایک طرف حضرت علیؓ شوہر بنت رسول اللہؐ، آنحضرتؐ کے برادر اور علم دین کے علم بردار ان کے ساتھ بہت سے سرور کائناتؐ کے صحابہؓ۔ دوسری طرف حضرت عائشہ صدیقہؓ حبیبِ خداؐ کی محبوب بیوی جن کے اوصاف سے احادیث بھری پڑی ہیں، اور جن کی پاکی قرآن مجید نے ثابت کی ہے۔ اس معرکۂ ہولناک کو جنگ جمل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ افسوس اس وقت کوئی ایک بشر بھی اپنے دل میں خیال نہیں کرتا تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اسلام کے حق میں کسی قسم کا بیج بونے لگے ہیں۔ ایک طرف حق کھڑا تھا دوسری طرف ہوا اور حرص کام کر رہے تھے (حضرت عائشہ صدیقہؓ محض دھوکا دے کر حضرت علیؓ کے خلاف کھڑی کی گئی تھیں)۔ الغرض کہتے ہیں کہ جب صف بندی ہو گئی تو حضرت علیؓ نے ارشاد کیا کہ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک رہ چکے تھے لشکر سے الگ ہو جائیں۔ میں ان کو جانتا ہوں مگر کسی کا نام لینا نہیں چاہتا۔ یہی بہتر ہے کہ وہ خود سمجھ لیں اور ہمارے پاس سے ہٹ جائیں۔ اس عجیب و غریب حکم کو سن کر بہت سے لوگ چلے گئے۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو کہ حضرت علیؓ کے سرگرم حامی اور مددگار تھے۔ ان میں مالک ابن اشترؓ جیسے لوگ تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کی بہت سی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر آپ نے اس بات کی کچھ پرواہ نہ کی اور حق کا ساتھ دیا۔ وہ فعلاً اور قولاً ثابت کر رہے تھے کہ میرا قتل عثمان میں کسی قسم کا دخل نہیں اور میں ان کے قاتلوں کی کسی صورت میں طرف داری نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن چونکہ مقابل میں حرص و آز کام کر رہے تھے اس لیے ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پردہ نشین خاتون تھیں، ان کو کیا خبر کہ معاملہ کیا پیش آ رہا ہے۔ اُنہیں تو اُلٹ پلٹ باتیں بتائی جاتی تھیں، اور حقیقت کو تو ان کے پاس آنے ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر حضرت علیؓ کے مخالفین بھی حق پر تھے تو اسی بات سے انہیں خیال ہو جانا چاہیے تھا کہ حضرت علیؓ کس قسم کا طرز عمل اختیار کر رہے ہیں، اور سوچتے کہ آخر ہم اصل واقعہ کو تو دیکھیں اور معلوم کریں کہ کس حد تک وہ شہادت عثمانؓ میں شریک تھے۔ مگر دیکھتا اور معلوم کرتا کون؟ وہ تو معاویہ کے جال میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنی حرص کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتے تھے۔ بار بار واقعات بتلا رہے ہیں کہ حقیقت کیا تھی، اور اصلیّت کیا تھی، اور حضرت علیؓ کی حالت کیا تھی۔ مگر وہ

لوگ تھے کہ متوجہ ہی نہیں ہوتے تھے۔

حضرت علیؓ نے بہت چاہا کہ خونریزی رُک جائے۔ اور لڑائی کی نوبت نہ آئے، مگر یہ بات نہایت ہی ناممکن تھی، اور آخر کار نہایت ہی خونریز جنگ ہوئی۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اگر ہو سکے تو حضرت عائشہؓ کا شتر شہید کیا جائے کیونکہ جب تک آپؓ میدانِ جنگ میں تشریف فرما ہیں لوگ کسی صورت باز نہیں آئیں گے، اور اپنے نبیؐ کے حرمِ محترم کے گرد جانیں قربان کر کے ڈھیر ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپؓ کے ارشاد سے کئی لوگوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا اور آخر مالک ابن اشترؓ آپؓ کے اونٹ کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے مہار پکڑنے والے کو قتل کر دیا، لیکن جھٹ دُوسرا اس کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی مارا گیا۔ اسی طرح جو مہار پکڑتا مالک ابن اشترؓ اسے قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ ستر کے قریب ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ جب ستر واں بھی مارا گیا تو آپ نے آگے بڑھ کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اونٹ کو تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا جس سے وہ گر کر مر گیا۔ حضرت محمدؐ ابن ابو بکر جو کہ حضرت علیؓ کی طرف سے جوہر شجاعت دکھا رہے تھے آگے بڑھے کہ اپنی ہمیشرہ محترمہ کا کجاوہ سنبھالیں اور اندر ہاتھ ڈال کر ان کو اُٹھالیں۔ جونہی آپؓ کے جسم اطہر پر غیر مرد کا ہاتھ لگا آپؓ نے غیظ و غضب میں فرمایا۔ ''جلے وہ ہاتھ جس نے اس جسم کو چُھوا جس کو سوائے رسولِ خدا کے آج تک کسی نے نہ چُھوا تھا۔'' محمدؐ ابن ابو بکرؓ نے کہا، ''اے بہن میں ہوں تمہارا بھائی۔'' جب حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو بہت خوش ہوئیں۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے نہایت ہی حفاظت کے ساتھ سرورِ کائناتؐ کی پاک دامن اور عصمت مآب زوجہ کو مدینہ منورہ پہنچا دیا، اور اس خطرناک جنگ جمل کا خاتمہ ہو گیا جس میں آپ کی طرف سے تین ہزار اور حضرت عائشہؓ کی طرف سے تیرہ ہزار مسلمان کام آئے، اور جو کہ خود غرض اور حریص لوگوں کی برپا کی ہوئی تھی، اور جو آیندہ کے لیے کئی لڑائیوں کا بیج بو گئی۔ اس کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ طلحہؓ اور زبیرؓ بھی اسی میں کام آئے تھے۔

لیکن یہاں پر ہی بس نہ ہوئی۔ ابھی تک اس آگ کے لگانے والا اور مسلمانوں کو آپس میں ٹکرانے والا، اسلام کو تباہ کرنے والا، اس میں نفاق اور ناچاقی کا بیج بونے والا، باقی تھا۔ وہ تو ابھی تک ملک شام میں اپنی زہریلی کوششوں میں نہایت ہی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مصروف تھا اور موقع کی تاک میں تھا کہ کب حق اور انصاف کے سر پر دیو کی طرح جا کھڑا ہو، اور اسلام کے نازک پودے کو جس کو آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے لگایا اور ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے اپنے تدبّر کے پانی سے اسے سینچا ایسا گھن لگائے کہ اس کی حالت

کبھی بھی سدھر نہ سکے، اور اپنے بعد ایک ایسی یادگار چھوڑ جائے جو کہ بظاہر شیعہ و سُنّی کی صورت میں ایک دوسرے کا گلہ کاٹیں، مگر حقیقتاً اسی گھن خوردہ پودے کو آری کی طرح آہستہ آہستہ کاٹ ڈالیں۔ افسوس ہے تو اس بات کا کہ کوئی بھی غور نہیں کرتا کہ اس فتنہ و فساد کا بانی کون تھا اور خواہ مخواہ لوگ ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ٹھنڈے دل سے ان واقعات پر غور کریں اور جو نفاق کے اسباب ہیں ان کو یک قلم اپنے درمیان سے نکال پھینکیں۔ ورنہ یاد رکھیں کہ اب آخری سانس ہے۔

جب معاویہ کو معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ نے جمل کا میدان مار لیا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اور ان لوگوں کی جماعتوں کو جن کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے انتقام پر اُبھار رکھا تھا لے کر مدینہ کی طرف بڑھے۔ دوسری طرف حضرت علیؓ کو بھی اس کا علم ہوا۔ وہ بھی اپنے لشکرِ جرار کو لے کر ان کے استقبال کے لیے آگے آئے۔ اب پھر حالت ملاحظہ ہو۔ ایک طرف تو شہنشاہِ دنیائے اسلام اور دوسری طرف ان کا معمولی صوبہ دار ہے۔ انہیں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ولائتِ شام کا والی مقرر کرتے ہیں اور آپ کیا کرتے ہیں کہ بادشاہی کا ڈنکہ اپنے نام بجوا کر ایک فرضی سبب کو (واقعۂ قتل عثمانؓ) درمیان لا کر خلیفۂ وقت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں اور چند مفسد لوگوں کو اپنے ساتھ گانٹھ لیتے ہیں جن میں سب سے بڑے حضرت عمرو بن العاصؓ ہیں۔ ان حضرت کی کارستانیاں اس قسم کی تھیں کہ اللہ کی پناہ! انہوں نے اپنے مکر وہ فریب سے وہ کام کئے جو کہ موجودہ زمانہ کے ایک مدبر کو بھی نہیں سوجھتے۔ خدائے واحد نے انہیں قبل از وقت پیدا کیا۔ ضرورت تو یہ تھی کہ اس زمانہ میں پیدا ہوتے اور دنیائے سیاست میں اپنے حیرت انگیز تدبّر سے ایک تہلکہ ڈالتے۔

غرضیکہ دونوں طرفوں کی فوجیں دریائے فرات کے پار مقامِ صفّین میں صف آرا ہوئیں اور ایک ماہ تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار محرم کا چاند ہوا اور ادب کے لحاظ سے ایک ماہ کے لیے لڑائی بند کی گئی۔ جب نیا ماہ شروع ہوا تو حضرت علیؓ نے خونریزی بند کرنے کی خواہش سے سفیر بھیجے تاکہ صلح ہو جائے۔ سفیروں نے سب حالات بیان کئے اور بتلایا کہ حضرت علیؓ کا کیا اقتدار ہے۔ اس پر معاویہ نے غضب آلودہ ہو کر کہا "میں بھی ابن حرب ہوں اور علیؓ سے خوب نپٹ لوں گا۔ اگر علیؓ کا قتلِ عثمانؓ میں دخل نہیں تو وہ ان کے قاتلوں کو ہمارے سپرد کیوں نہیں کرتے تاکہ ہم ان کو سزا دیں۔" سفیر نے کہا۔ "ان کے قتل میں تم ایسے ایسے بزرگ صحابہؓ کا نام لیتے ہو جو کہ سراسر بے انصافی ہے۔ ہم کس طرح بے گناہوں کو تمہارے سپرد کر دیں۔" چنانچہ سفارت

واپس ہوئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد تین سفیر معاویہ کی طرف سے آئے۔ ان میں سے ایک نے نہایت ہی گستاخانہ لہجہ میں کہا۔ ''حضرت عمرؓ کے زمانہ کی طرح مشورہ عام کرنے کی اجازت دیجیے تاکہ ہم لوگ آپ کو یا معاویہ کو اپنا امیر منتخب کر لیں۔'' اس گفتگو سے آپ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ معاویہ حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام لینے آرہے ہیں اور سفارت اس قسم کی ارسال ہوتی ہے۔ وہ اب ان کا انتقام کا خیال کہاں گیا۔ یہ پہلے ہی کہ دنیا تھا تاکہ اس قدر خون و قتل کی نوبت ہی نہ آتی۔ آخر معاویہ بھی سچے تھے، انہیں معلوم تھا کہ اگر شروع میں ہی خلیفہ بننے کا خیال لوگوں پر ظاہر کرتے تو تمسخر اڑتا کہ کس استحقاق کے ساتھ خلافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جبکہ انہوں نے لوگوں کو قتل عثمانؓ کے جھوٹے افسانے سنا کر ان کو اپنی طرف کر لیا اور یقین ہو گیا کہ وہ آپ کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں تو اب صاف طور سے اپنے دل کی بات نکالی۔ آپ دیکھیے، انہوں نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کے لیے کیا کیا باتیں بنائیں اور کس طرح ''مسلمان سب بھائی بھائی ہیں'' کے سبق کو اپنے مکارانہ منصوبوں سے لوگوں کے لوح قلب سے محو کر دیا۔

لیکن جب معاویہ کے سفیروں نے آتے ہی اس قسم کی بات کی تو حضرت علیؓ کو جلال آگیا اور معاویہ کی اس ناپاک خواہش کو ان الفاظ سے رد کیا جس کا ایک ایک حرف حقیقت آشکار کر رہا ہے اور جو کہ ہم ناظرین کے ملاحظہ کے لیے حرف بحرف تاریخ طبریؒ سے لے کر اس جگہ نقل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ''معاویہ کون ہے کہ اس قسم کی خواہش کرتا ہے۔ مسلمانوں نے اس کام کو اتفاق رائے سے انجام دے دیا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے کہ وہ اس کو مسترد کرتا ہے۔ آنحضرتؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپؓ نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر نہ کیا۔ لوگوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو یکے بعد دیگرے خلیفہ بنایا۔ جب انہوں نے عدل وانصاف کے ساتھ اموراتِ خلافت انجام دیئے تو میں نے بھی ان کی بیعت کر لی اور لوگوں نے ان کے عدل سے آسائش حاصل کی۔ پھر حضرت عمرؓ کے بعد لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنایا، لیکن انہوں نے ایسے کام کیے جن کو لوگوں نے پسند نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کا محاصرہ کر کے آپ کو قتل کر دیا لیکن میں گھر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد لوگ میرے پاس جمع ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ ہم تیرے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے منظور نہ کیا۔ انہوں نے کہا، اگر تم قبول نہ کرو گے تو لوگ تمہارے مخالف ہو جائیں گے۔ میں نے منظور کر لیا اور ان دونوں طلحہؓ اور زبیرؓ نے بھی مجھ سے بیعت کر لی لیکن اس کے بعد وہ (طلحہؓ و زبیرؓ) میرے مخالف ہو گئے۔ مگر خدائے عزوجل نے مجھ کو ان پر نصرت عطا کی اور معاویہ پر بھی دے گا۔ وہ لوگ معاویہ کی

قسم کے لوگوں میں سے نہ تھے، وہ مہاجرین تھے اور طلوع اسلام سے ہی حلقہ بگوش اسلام تھے اور اصحابِ حدیبیہ میں سے تھے۔ انہوں نے آنحضرتؐ پر سے اپنا مال قربان کر دیا ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی شان میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے۔ ''خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے۔'' اور یہ رضامندی اس کے لیے ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ لیکن برعکس اس کے معاویہ کو ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں ہے۔ وہ ان میں سے ہے جو مجبوراً دباؤ سے مسلمان ہوئے، اس کو نہ دین میں نصرت ہے اور نہ اولیّت کا حق حاصل ہے۔ اس کو مولفۃ القلوب کہتے ہیں۔ وہ اس باپ کا فرزند ہے جو کہ زمانہ میں نیچی طبعیت کا آدمی تھا، یعنی ابوسفیان، اور اس ماں کا بیٹا ہے جو ''کلیجہ نکالنے والی ہے'' یعنی ہندہ۔ اس کو اسلام میں خلافت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ آج میں تم کو قرابت داری کے تعلق کے قائم کرنے پر متوجہ کرتا ہوں اور مخالفت سے باز رہنے کی نصیحت کرتا ہوں۔''

جب ان سفیروں نے آپ کی یہ تقریر سُنی تو چونکہ ان کے دل سیاہ ہوئے ہوئے تھے اس لیے وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اُس وقت حضرت علیؓ نے یہ آیت پڑھی۔ ''تم بہروں کو پیام نہیں سنا سکتے، جبکہ وہ منہ پھیر کر اُلٹے چلے گئے۔''

جب معاویہ کی حرص کے باعث صلح کی کوئی صورت نہ نکلی تو آخر کار لڑائی کی ٹھن گئی اور دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کو نیچا دکھلانے کے لیے آراستہ ہو گئیں۔ حضرت علیؓ نے اپنے لشکر کو اصولِ اسلام کے مطابق آراستہ کیا اور اس میں اپنی تقریر سے وہ جوش پیدا کیا کہ مرنے مارنے پر پل پڑے اور وہ وہ جوہر مردانگی دکھلائے کہ دنیا مبہوت رہ گئی۔ حضرت علیؓ ایسے شجاع تھے کہ جس میدان میں گئے دشمن ان کے مقابل نہ ٹھہر سکا۔ اُنہوں نے صفوں سے آگے بڑھ کر للکار کر کہا ''اے معاویہ! آ تو میرے سامنے آ! کیوں مسلمانوں کا خون بہاتا ہے۔ ہم تم لڑ کر فیصلہ کر لیں۔'' کیا آپ خیال نہیں فرما سکتے کہ ان الفاظ میں کیا صداقت بھری ہوئی تھی۔ کیا حضرت علیؓ کے اس قسم کے ارشاد میں کسی قسم کی خود غرضی کی جھلک پائی جاتی ہے؟ ان الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مسلمانوں کا خون بہانا کسی صورت بھلا نہیں لگتا تھا اور اسی لیے فرما رہے تھے کہ ''آ ہم تم فیصلہ کر لیں۔'' اس کو کہتے ہیں جوہر شجاعت، اس کو کہتے ہیں قوتِ مردمی، اور اس کو کہتے ہیں ہمّت مردانہ۔ جب عمرو ابن العاصؓ نے یہ الفاظ سُنے تو انہوں نے معاویہ سے کہا۔ ''جائیے آپ کی طلبی ہے، مردانگی تو یہ ہے کہ اس بلاوے کا خود جا کر جواب دو۔'' اس پر معاویہ نے نہایت ہی بزدلانہ طور سے کہا کہ ''میں ہرگز علیؓ کے

سامنے نہ جاؤں گا۔ کوئی شخص ایسا نہیں سنا جو علیؓ کے مقابلہ پر جا کر زندہ رہا ہو"۔ ہمیشہ قاعدہ ہے جو شخص گنہگار اور مجرم ہوتا ہے اُسے موت کا خوف رہتا ہے اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے، حالانکہ اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ جو کام میں کر رہا ہوں حقیقتاً بُرا ہے لیکن اپنے نفس سے مجبور ہوتا ہے۔ یہی حال معاویہ کا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ خلیفۂ وقت کے خلافت بغاوت کر رہا ہوں لیکن حضرت علیؓ کی شان و شوکت بسبب اپنے قدیمی خاندانی بغض و عناد کے انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور اس لیے ہر ممکن و ناممکن طریقہ سے انہیں زک پہنچانے میں کوشاں تھے۔

غرضیکہ لڑائی پھر زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی اور معاویہ کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ بھی تیار تھے کہ دُم دبا کر میدان جنگ سے ایسے غائب ہو جائیں کہ دمشق میں ہی جا کر سانس لیں، لیکن پھر اپنے آپ کو کسی قدر سنبھال کر انہوں نے عمرو ابن العاص سے کہا کہ کوئی آخری تدبیر نکالو۔ عمرو ابن العاص بھلا مکر و فریب کے مجسمہ تھے۔ انہوں نے معاویہ کو تسلی دی اور لشکر کو حکم دیا کہ قرآن مجید کو نیزوں پر باندھ کر بلند کر دو۔ فوراً اس کی تعمیل کی گئی۔ جب حضرت علیؓ کی فوج نے کلام الٰہی کو اپنے سامنے دیکھا تو سپاہیوں نے فوراً تلواریں نیام میں کر کے سر جھکا دئیے۔ حضرت علیؓ نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ ان کا فریب ہے لیکن راسخ الاعتقاد مسلمانوں نہ مانا اور الٹے حضرت علیؓ کو دھمکانے لگے۔ جب آپ نے یہ حالت دیکھی تو آپ نے لڑائی بند کرنے کا حکم دے دیا۔ آخر کار دونوں طرفوں سے فیصلہ کرنے کے لیے ثالث مقرر کئے گئے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے موسیٰ اشعریؓ اور معاویہ کی طرف سے عمرو ابن العاص ہوئے اور آٹھ ماہ کی مُہلت دی گئی۔ اس عرصہ کے بعد دونوں ثالثوں نے دومتہ الجندل کے مقام پر خلوت میں مشورہ کیا کہ حضرت علیؓ اور معاویہ دونوں کو برطرف کر کے کسی تیسرے کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس کو پسند کر لیا، لیکن جب عام جلسہ میں تقریر کا موقع آیا تو عمرو ابن العاص نے اپنی قدیمی مکارانہ چال سے کہا کہ پہلے ابو موسیٰ تقریر کریں۔ اس پر انہوں نے کھڑے ہو کر کہا۔ "میں نے علیؓ اور معاویہ دونوں کو خلافت سے معزول کیا۔ مسلمان کسی اور کو خلیفہ منتخب کر لیں۔" ان کے بعد عمرو ابن العاص منبر پر گئے اور کہنے لگے۔ "میں نے علیؓ کو خلافت سے معزول کیا اور ان کی جگہ معاویہ کو قائم کیا کیونکہ وہی حقدار ہے۔" جب ابو موسیٰ نے اس قسم کی لغو اور بیہودہ بات عمرو ابن العاص کے مُنہ سے سُنی تو جھلّا اُٹھے اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ لیکن انہوں نے کچھ بھی جواب نہ دیا اور خوف زدہ لشکر کو واپس لے کر دمشق چلے گئے اور معاویہ کو خلیفہ بنا لیا۔

اس کتاب میں تواریخی واقعات کے بیان کرنے سے ہمیں سروکار نہیں ہے لیکن صرف واقعاتِ تاریخ کے حوالوں سے دکھلانا ہے کہ خلافت کی کیا حالت چلی آئی ہے اور اس میں حریص اور خود غرض لوگوں کے سبب سے کیا کیا رخنہ اندازیاں ہوتی رہی ہیں۔ ناظرین ان تمام واقعات پر غور کریں اور دیکھیں کہ اصل میں کیا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ جو معاویہ کو حضرت علیؓ پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاویہ کی شان میں کوئی ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو جو کہ ان کے لیے بُرا ہو کیونکہ اگر انہوں نے حضرت علیؓ کا مقابلہ کیا تو وہ ان کا ایک اجتہادی مسئلہ تھا کیونکہ وہ ایک صحابی تھے۔ لیکن ہم انہیں کہتے ہیں کہ اجتہاد تو وہ ہوتا ہے جس میں انسان اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہے اور ممکن ہوتا ہے کہ کسی وقت اس میں غلطی بھی ہو جائے۔ مگر یہاں تو واقعات دکھلا رہے ہیں کہ صریحاً مکر و فریب سے کام لیا جا رہا تھا اور شہادتِ عثمانؓ ایک بہانہ تھا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ حضرت علیؓ ہر ایک طرح سے معاملہ سلجھانے کے لیے تیار تھے۔ کیا واقعات نہیں بتلا رہے کہ معاویہ اور اس کے ایسے لوگ کس طرح چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کو زک ہو، مگر اللہ جل شانہ کو منظور تھا کہ ان کو ان حریص لوگوں پر فتح ہو کیونکہ وہ حق پر تھے۔ ہم پھر کہیں گے کہ معاویہ کے طرف دار غور کریں اور ہٹ اور ضد کو ترک کر دیں۔ نہایت ہی مستند تواریخ جن سے ہم نے اخذ کر کے یہ واقعات یہاں قلم بند کیے ہیں صاف طور سے شہادت دے رہی ہیں کہ معاویہ کو حضرت عثمانؓ کے قتل کے انتقام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو اپنے لیے خلافت چاہتے تھے۔ خیر یہی بات لیجیے، اگر انہیں حضرت عثمانؓ کے قتل کا انتقام لینا مقصود تھا تو پھر زک اُٹھا کر دمشق کیوں چلے گئے۔ وہ تو حق کی حمایت میں کھڑے رہتے اور بغیر انتقام ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ اچھا یہ بھی نہیں۔ اس پر غور کیجیے، جنگ تو صرف حضرت عثمانؓ کے قتل کے سبب ہو رہی تھی۔ عمرو ابن العاص کا ثالث کی حیثیت میں سمجھوتا کرنا کہ ان دونوں کو برطرف کر دو اور پھر علانیہ طور سے اظہار کرتے وقت اپنے الفاظ سے پھر جانا کیا معنی رکھتے تھے۔ انہیں واقعات کے باعث یہی یقین ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ حق پر تھے اور معاویہ خواہشات نفسانی کے تابعدار ہو رہے تھے۔ وہ علماء (نام نہاد) جو شیعوں کو زک دینے کے لیے بیجا طور سے معاویہ کی طرف داری کا دم بھرتے ہیں، تاریخی واقعات کا بغور مطالعہ کریں اور حضرت علیؓ کے مقابلہ پر ان کو کسی صورت ترجیح دینا کیا معنی، ان کے سامنے معاویہ کا تذکرہ تک بھی منہ پر نہ لاویں۔ معاویہ نے جو کچھ کیا اسلام کے حق میں بہت بُرا کیا، اور ایسی ایسی مثالیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے جن کے سبب مسلمان آج تک مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

ہم حیران ہیں کہ معاویہ کا خلافت میں کیا حق تھا۔ اگر کوئی کہے کہ وہ تدبیر اور سیاست میں مانے ہوئے تھے

اس لیے خلافت کے امورات کے انجام دینے میں حضرت علیؓ سے زیادہ موزوں تھے تو یہ نہایت فضول بات ہے۔ کیا ایک بادشاہ کے وزراء اور امراء اس سے بڑھ کر مدبّر نہیں ہو سکتے ہیں؟ اگر ایسی بات نہیں ہے تو اکبر کی جگہ ابوالفضل اور ٹوڈر مل ہندوستان کے بادشاہ ہونے چاہیے تھے کیونکہ شہنشاہ ایک بے علم جاہل تھا اور وہ نہایت ہی مدبّر تھے۔ ہزاروں بادشاہ ایسے گزرے ہیں جن کے وزراء ان سے بڑھ چڑھ کر امورات ملکی کی انجام دہی کی لیاقت رکھتے تھے لیکن ان کے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں گزرا کہ ان کو برطرف کر کے خود تختِ سلطنت پر متمکن ہو جائیں۔ اگر معاویہ کو سیاست میں زیادہ دسترس تھی تو وہ ان کے دست و بازو بنتے اور انہیں معاملاتِ خلافت میں امداد دیتے جیسا کہ حضرت علیؓ خود شیخین کا (ابوبکرؓ و عمرؓ) ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔

یاد رکھیئے، اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ حق اور راستی کی طرف داری کریں اور لغویات میں کبھی نہ پڑیں۔ بلا انکار معاویہ آنحضرتؐ کے صحابیؓ تھے۔ لیکن اگر صحابی ہونے کے باوجود ان سے ایسے افعال سرزد ہوئے جو کہ صحابہؓ کے طرز عمل کے منافی تھے تو ہم آخر کیا کریں گے۔ انہیں تو چاہیے تھا کہ چونکہ ان کو سرور کائناتؐ کی صحبت حاصل تھی اور ان کی پاک تعلیم سے بہرہ یاب ہوئے تھے، وہ ان کی تعلیم کی پیروی کرتے نہ کہ اہلبیت کے درپے ہو کر ان کے لیے بلائے بے درماں ثابت ہوتے۔

# آٹھویں فصل

## خلافتِ بنی اُمیّہ

### معاویہ بانیٔ تنزّل اسلام

جنگ صفین میں معاویہ کو زک اٹھانے کے بعد ایک قسم کی ہوس لگی کہ کس طرح حضرت علیؓ کو منصبِ خلافت سے برطرف کر کے خود بادشاہ بن جائیں۔ لیکن آپؓ کی زیست تک ان کا یہ مدعا پورا نہ ہوا۔ آخر کار قضائے الہٰی سے حضرت علیؓ نے فیروز کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش کیا۔ لوگ حضرت حسنؑ کے گرد جمع ہوئے اور ان سے بیعت کی، لیکن اس جگر گوشۂ رسول اکرمؐ نے اپنے زہد واتقا کے باعث خلافت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور آنحضرتؐ کی اس حدیث کی تصدیق فرمائی جس میں آپ نے فرمایا ہے، ''میرا یہ لڑکا (حسنؑ) دو زبردست گروہوں میں صلح کا باعث ہو گا۔'' اب کیا تھا، معاویہ کی باچھیں کھل گئیں اور اس چیز کو جسے وہ مکر وفریب اور دھوکا سے نہ لے سکے، اپنے قبضہ میں آتے ہوئے دیکھ کر جامہ سے باہر ہونے لگے۔ اب انہیں موقعہ مل گیا کہ بلاشرکتِ غیرے اپنی سیاسی تدبیروں کو عمل میں لائیں۔ جس خلافت کے لیے وہ شہادتِ عثمانؓ کے بعد نہایت ہی کوشش کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے اب جبکہ خود بخود ان کے قابو میں آ گئی تو انہیں فکر ہوئی کہ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے خاندان کے لیے مخصوص کیا جائے۔

جیسا کہ پیشتر بھی ذکر کیا گیا ہے، آنحضرتؐ نے خلافت کی بنیاد جمہوریت پر رکھی تھی اور یہ بات مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی کہ باتفاق رائے جسے چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں۔ ہاں صرف اس قدر اختیار دیا ہوا تھا کہ خلیفہ مرتے وقت کسی کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کر جائے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ آنحضرتؐ، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے کس خوبی سے اس معاملہ کو انجام دیا، اور خاص کر کے حضرت عمرؓ کو اس میں نہایت ہی کوشش کے ساتھ اہتمام کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے لڑکے کو اس کے لیے نامزد نہ کیا حالانکہ اکثر لوگوں کی خواہش تھی۔ انہوں نے اپنے قبیلہ میں سے اس کے انتخاب کے لیے مشورہ تک میں کسی کو نہ لینے دیا اور اسی فکر میں رہے کہ کسی طرح خلیفہ کا انتخاب نہایت ہی موزوں طریقہ کے ساتھ عمل میں آئے۔ برخلاف اس کے اب معاویہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے فرزند یزید کو جس کی بدذاتیوں، حرام کاریوں اور فسق وفجور

سے ایک دنیا واقف تھی، ولی عہد بنایا اور باوجود اس بات کے کہ لوگ اس کے افعال سے واقف تھے، اور جانتے تھے کہ اس لعین کو نہ نماز سے کام نہ روزے سے سرور کار، ہر وقت شراب میں غرق اور شکار میں مشغول رہتا ہے۔ تاہم آپ نے زور سے، زبردستی سے، سختی سے، دھمکی سے، نرمی سے زندگی میں ہی اس کے لیے ان سے بیعت لے لی۔ جو دیندار لوگ اس بات میں مزاحم ہوئے ان کو چپکے چپکے موت کے گھاٹ اتار دیا اور جن کی طرف سے کھٹکا تھا کہ مزاحم ہوں گے ان کو بھی مروا دیا۔ اور اگرچہ حضرت حسنؑ نے بہ رضا و رغبت ان سے بیعت کر لی تھی لیکن ''بمصداق چور کی ڈاڑھی میں تنکا''، معاویہ کو ہر وقت ان سے بد ظنی رہتی تھی اور اسی اندیشہ میں تھے کہ کسی طرح اس درویش منش نبیرۂ رسول اللہؐ کو بھی قتل کیا جائے۔ چنانچہ وہ عابد و زاہد، گوشہ نشین نہایت ہی امن کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ معاویہ خونخوار معاویہ نے ان کو نہایت ہی مکروہ طریقہ سے زہر دلوا دیا اور اپنے پہلو سے اس کانٹے کو نکال دیا۔

غور کیجیے، انہوں نے دنیا کی ہوس و حرص کو پورا کرنے کے لیے کس قدر بے گناہوں کے خون کیے اور آیندہ کے لیے خونریزی کی بنیاد رکھ گئے۔ انہوں نے اسلام میں ایک ایسی بدعت نکالی جس کے سبب سے وہ اب تک مصیبت میں مبتلا ہے اور جو کہ اس کے سب سے بڑے اصول کے منافی ہے۔ اسلام نے جمہوریت کی بنیاد رکھی، انہوں نے اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا۔ اسلام نے ہر ایک مسلمان کو حق دیا کہ وہ معاملات ملکی میں ایسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا کہ ایک خلیفہ لیکن انہوں نے اسے ایک دم مسترد کر دیا۔ انہیں کیا حق حاصل تھا کہ زندگی میں ہی اپنے لڑکے کو جانشین مقرر کرتے۔ یہ تو از روئے قانون عامۃ المسلمین کا کام تھا کہ جسے چاہتے ان کے مرنے کے بعد اپنا امیر بناتے۔ کیا انہوں نے ایسا کرنے سے اسلام کی تعلیم کی پیروی کی؟ کیا آنحضرتؐ اس اصول پر خود بدولت کاربند نہیں ہوتے آئے تھے؟ کیا وہ ہر ایک مہم کو صحابہؓ کے صلاح و مشورہ کے ساتھ انجام نہیں دیتے تھے؟ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو وہ معاویہ نے کیوں ان کے خلاف کیا؟ اس کا جواب صرف یہی دیا جا سکتا ہے کہ انہیں دنیا کی طمع تھی اور اسلام سے کسی قسم کی محبت نہیں تھی۔ انہوں نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ جو کچھ ہے دنیا ہی ہے۔ وہ خود جانتے تھے کہ یزید فاسق ہے، فاجر ہے، سیاہ کار ہے، زانی ہے، شرابی ہے، لیکن چونکہ انہیں اپنے خاندان میں ہی سلطنت قائم رکھنی تھی اس لیے انہیں کسی بات کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ یزید کو ولی عہد بناتے وقت کسی نے جرأت کے ساتھ معاویہ سے کہا کہ یزید کا چال چلن اچھا نہیں ہے، آپ اسے ولی عہد بنا کر مسلمانوں سے دشمنی کیوں کرتے ہیں۔ مگر انہوں نے جواب دیا۔ ''جس وقت اس کے سر پر خلافت کا

بارپڑے گا خود بخود سمجھ جائے گا۔'' وہ خوب سمجھا اور نہایت اچھے طریقہ کے ساتھ سمجھا۔ معاویہ اگر بعد میں زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ کس طرح اس نے ان کے آقائے نامدار کے فرزندوں کا خون گرایا۔

حضرت معاویہ! حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اسلام پر بڑا ظلم کیا۔ اسلام کی حقیقی تعلیم کو بیخ و بن سے اکھاڑ مارا، اس کو تباہ کیا۔ آپ نے یزید کی ولی عہدی میں ایک ایسی بات کی بنیاد رکھی جو کہ اسلام کے حق میں ہلاکت ہے۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو اسلام کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ آپ کے ایسے طرز عمل کے بعد سے ہی ہم آج تک دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی پیروی میں کس قدر خون ہو رہے ہیں۔ حقیقی بھائی ایک دوسرے کی گردنوں پر چُھریاں چلاتے ہیں۔ اسلام نے کیا ہی زرّیں اصول باندھا تھا کہ مسلمان جسے چاہیں اپنا خلیفہ بنالیں، اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں رکھی تھی۔ مگر آپ نے تخصیص باندھ دی اور اس کے باندھنے میں ہزاروں بے گناہوں کا خون کیا جو کہ آپ کی گردن پر ہے۔

حضرت عمرؓ نے لوگوں کے دلوں میں ایک ایسی روح پھونکی تھی کہ ان کا میلانِ طبع سادہ زندگی بسر کرنے کی طرف ہو گیا ہوا تھا۔ وہ اس معاملہ میں نرمی اور سختی سے کام لیا کرتے اور خود اپنی ذات سے عملی نمونہ پیش کرتے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو مسلمان عیش و عشرت میں پڑ کر اپنی طاقتوں کو ضائع نہ کریں اور ان میں وہ چُستی ہے جو کہ ان میں فطرۃً پائی جاتی ہے۔ دوسرے ان کی سادہ زندگی کا اثر دوسری اقوام پر اس قدر ہو گا کہ وہ خود بخود مائل بہ اسلام ہو جائیں گی۔ آپ نے ان کی زندگی کا مرقع گذشتہ اوراق میں ملاحظہ کیا ہے اور دیکھ لیا ہے کہ وہ کس حد تک شاہانہ زندگی سے متنفر تھے۔ لیکن برعکس اس کے معاویہ نے عیش و عشرت کی زندگی شروع کی۔ ان کا دربار شاہانہ دربار ہوا کرتا تھا اور ہر ایک قسم کے عیاشانہ سامان سے مرصّع تھا۔ وہ فرعون کی طرح تختِ شاہی پر جلوہ فرما ہوتے۔ حضرت عمرؓ کے عہد کی مجلسِ شوریٰ جس کے اجلاس مسجد نبوی میں ہوا کرتے تھے اب ایک داستانِ پارینہ رہ گئی تھی۔ کسی کی کیا مجال ہوا کرتی تھی کہ آپ کی رائے کے خلاف اظہارِ خیال کرے اور آپ کا حکم گویا خدا کا حکم ہوا کرتا تھا جس کی سرتابی کی سزا موت تھی۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ آخری فیصلہ ہوا کرتا تھا اور کسی کو ہمّت نہیں ہوا کرتی تھی کہ اس کے خلاف چون وچرا کرے۔ وہ ایک جبّار بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ عامۃ الناس سے خلط ملط رکھنا عار خیال کرتے اور یہاں تک کیا تھا کہ اس عبادت میں جس میں اسلام نے فقیر و بادشاہ کو برابر کا حق دیا ہے آپ نے تفاوت ڈال دی، اور بادشاہ کے لیے مسجد میں ایک مخصوص جگہ بنوائی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل بادشاہ کو کورنش بجالانے کا طریقہ آپ نے ہی جاری کیا

اور مسلمانوں کی گردنوں میں حلقۂ غلامی ڈالا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں میں سادہ زندگی رہی ان میں ترقی رونما تھی، لیکن جونہی وہ عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے ان کا تنزل شروع ہو گیا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں، کیا انہوں نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ اس قسم کی زندگی کے رواج دینے والا کون تھا؟ تاریخ کے مطالعہ سے آپ کو اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ معاویہ تھے۔ انہوں نے ان ریگستانی عربوں کو جو کہ اشاعتِ اسلام کے آلہ تھے، گاڑھے کے کپڑے پہنتے، جَو کی سوکھی روٹی کھاتے، اور جہاں خدائے عزوجل کا نام آتا گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہو جاتے، عیش و عشرت کا بندہ بنا دیا۔ ان کا موٹے کپڑے کا لباس متبدل بہ حریر و دیبا ہو گیا۔ ان کی سادہ خوراک نے پُر تکلف کھانوں کی جگہ لے لی اور اب وہ مقصدِ خلافت کو کلیتہً فراموش کر بیٹھے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ معاویہ کو بُرا مت کہو اور ان کی شان میں کوئی ایسا کلمہ نہ نکالو جو کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے لیے ہتک آمیز ہے۔ لیکن اس کے جواب میں ہم ان سے بافسوس کہتے ہیں کہ اس قسم کے مسلمانوں نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ معاویہ نے اہلبیت کے حق میں کیا کچھ نہیں کیا۔ کیا اس قسم کے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیے جائز ہے کہ اہلبیت اور حضرت علیؓ کی شان میں وہ سب و شتم بکیں، کیا وہ لوگ گوارا کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک مسلمان ان کو بُرا کہے۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کے اہلبیت کی تعظیم و تکریم کریں اور جو کوئی ان کو بُرا کہے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اگر ایسا ہے، تو تاریخ کے ورق الٹیے اور دیکھیے کہ معاویہ حضرت علیؓ کی شانِ مبارک میں کس قسم کے کلمات استعمال کرتے رہے۔ ان کا معمول تھا کہ منبر پر چڑھ کر جمعہ کے روز ان پر تبرّا بھیجتے اور انہیں اعلانیہ بُرا بھلا کہتے۔ کیا معاویہ کو اہلبیت کے ساتھ محبّت تھی؟ کیا ان کا اس قسم کا فعل مسلمان پسند کرتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ ان کی شان کے خلاف کوئی ایسا ویسا کلمہ زبان سے نہ نکالا جائے۔ کیا معاویہ کی شان حضرت علیؓ سے بڑھ کر تھی؟ افسوس مسلمانوں نے اسی ضد کے باعث اسلام کو ضعف پہنچایا۔ یاد رکھیے، معاویہ ایک ایسا شخص ہوا ہے جس نے اسلام کی تباہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کے تبرّا بھیجنے کے فعل نے مسلمانوں میں ایسے تفرقہ کی بنیاد ڈالی ہے کہ آج تک اس کے ہاتھوں وہ تباہ ہو رہے ہیں۔ انہیں ہی سے شیعہ و سنی کی بنیاد پڑی جو کہ اسلام کے لیے ناسور کا حکم رکھتی ہے۔ آپ کو کہیں بھی پتا نہیں ملے گا کہ ان سے پہلے بھی مسلمانوں میں کبھی دو گروہ ہوئے ہیں۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں ذرا سا اختلاف واقع ہوا تھا لیکن وہ بہت ہی جلدی

مٹ گیا، اور پھر حضرت عثمانؓ کے عہد تک کسی کو اس کا خیال تک نہیں آیا۔ جب معاویہ کا زور ہوا تو حضرت علیؓ کے طرف داروں نے بجائے اس کے کہ معاویہ کو بُرا کہتے، خلفائے راشدین کو بُرا بھلا کہنے لگے اور اسی کے سبب آج ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ و سنی ایک دوسرے کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اگر معاویہ اس قسم کی ادھم نہ مچاتے تو ہمیں یقین ہے کہ اسلام میں دو گروہ کبھی بھی نہ ہوتے۔ انہوں نے ہی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑایا۔ انہوں نے ہی ''انّما المؤمنین اخوۃ'' کے زرّیں اصول کو توڑا۔ انہوں نے ہی اسلام میں تفرقہ ڈالا۔ انہوں نے ہی بھائیوں سے بھائیوں کے گلوں پر چُھریاں چلوائیں۔ انہوں نے ہی بزرگوں کو بُرا کہلوایا۔ انہوں نے ہی اسلام میں جمہوریت کو تباہ کروایا۔ انہوں نے ہی اسلام میں بغاوت کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ہی مسلمانوں میں سادہ زندگی کو نیست و نابود کر دیا۔ اُنہوں نے ہی اسلام میں فرعونیت کا مادہ پیدا کیا۔ انہوں نے ہی آیندہ کے لیے مسلمانوں کی گردنوں میں غلامی کا طوق ڈلوایا۔ انہوں نے ہی مسلمانوں کو عیش و عشرت کی زندگی کا عادی بنایا۔ انہوں نے ہی عربوں کے جوہر شجاعت کو غارت کروایا۔ انہوں نے ہی عربوں کی آزادی کو سلب کروایا۔ غرضیکہ کیا کچھ بیان کیا جائے۔ انہوں نے وہ کچھ کیا جس کا اسلام کی سادہ تعلیم ہوتے ہوئے گمان بھی نہیں تھا۔

اگر معاویہ خلافت کا دعویٰ نہ کرتے تو آج تک مسلمان خود بخود نہایت ہی خاموشی کے ساتھ خلیفہ کا انتخاب کرتے چلے آتے، اور چونکہ ان کے دلوں میں اس کے متعلق خلفائے راشدین کا طرز عمل پیش نظر ہوتا اس لیے اس میں کسی قسم کا نقص واقع نہ ہوتا۔ انہوں نے خلافت کے لیے بے جا دعویٰ کر کے لوگوں میں ایک تازہ بدعت پیدا کر دی۔ اور وہ لوگ جو ہوس و حرص کے بندے ہیں ان کی مثال سامنے رکھ کر خود خلافت کے مدعی بننے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا مرکز ہل گیا اور وہ ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے دعویٰ خلافت سے پہلے کس طرح مسلمان ایک مرکز پر جمع تھے، لیکن جب انہوں نے خلافت کے لیے ہاتھ مارنے شروع کیے تو مسلمانوں کا مرکز ٹوٹ گیا اور دنیائے اسلام دو حصّوں میں منقسم ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک اسلام میں تفرقہ اندازیاں اور رخنے پڑے ہوئے ہیں جو کہ کسی صورت رفع ہوتے ہی نہیں، اور دن بدن زیادہ ہو رہے ہیں۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے جزیرۃ العرب کی یہ حالت تھی کہ لوگ قبائلوں میں منقسم تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑ کر کٹے مرے جا رہے تھے۔ آپ نے اسلام کی پاک اور سادہ تعلیم کے ذریعہ سے ان کی دشمنیوں کو دُور کیا اور ایک دوسرے کا بھائی بھائی بنا دیا۔ معاویہ نے پھر بنی ہاشم اور بنی اُمیّہ کے پرانے عناد کو زندہ

کیااور لوگوں کو بنی ہاشم سے بغض اور دشمنی کرنے پر اُبھارا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ پھر جاہلیّت کے زمانہ کی طرح بدویت کی طرف چلے گئے اور قبیلوں اور خاندانوں کے عناد تازہ ہو گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بعد ہی بنی ہاشم بنی اُمیّہ کے دشمن ہو رہے ہیں، اور پھر بنی عباس بنی فاطمہ کے ساتھ الجھ رہے ہیں، اور بنی فاطمہ بنی امیّہ کے نشانۂ ستم بن رہے ہیں۔

# نویں فصل

## واقعہِ کربلا

### حُریّت اور آزادی کا خُون

اگرچہ معاویہ کے مرکزِ خلافت کے مدینہ منورہ سے لے جانے کے بعد حُریّت اور آزادی کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ابھی تک آنحضرتؐ کی تعلیم اور خلفائے راشدین کے حیرت انگیز طرز عمل کی یاد تازہ تھی، اور اُس وقت بھی جب کبھی لوگ کسی خلیفہ کو اسلام کے اصولوں کے خلاف اپنی روش رکھتے دیکھتے تھے تو گوارا نہیں کرتے تھے کہ اسلام کی پاک تعلیم کی خلاف ورزی کی جائے اور وہ چُپ رہیں۔ جس طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں بلا روک ٹوک نہایت ہی دلیری کے ساتھ خلیفہ کے فعل پر نکتہ چینی کرنے کا حق رکھتے تھے اسی طرح وہ اب بھی اپنا استحقاق سمجھتے کہ اگر وہ خلافِ شرع کوئی کام کرے تو اس سے اُسے روکیں۔

حضرت امام حسنؑ نے اپنی نیک طینی، نیک نفسی اور پاک بازی کی وجہ سے خلافت کو ترک کر کے صرف اس لیے کہ اسلام میں تفرقہ نہ پڑے معاویہ کی بیعت کر لی تھی۔ چنانچہ انہوں نے امام مظلوم کو اس کا یہ صلہ دیا کہ ان کو بلا سبب زہر دلوا کر شہید کر دیا اور ایک ایسا خون اپنی گردن پر لے گئے جس کا قیامت کے روز ضرور بضرور ان سے مواخذہ ہو گا، اور پھر انہیں معلوم ہو گا کہ اس دن ظالموں کا کیا حشر ہو گا اس کے بعد انہوں نے جیسا کہ پیشتر بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی زندگی میں ہی اپنے فاسق، فاجر، شرابی اور زانی لڑکے کے لیے بیعت لینی شروع کر دی اور نہایت ہی ظلم اور جور کے ساتھ لوگوں کو اس کی اطاعت پر مجبور کیا۔ چنانچہ معاویہ کی موت کے بعد یزید نے بھی اسی طرح اپنی خلافت لوگوں سے منوانی چاہی اور سختی سے لوگوں سے اپنی بیعت لی۔ چونکہ خلافت اور حکومت اس کے قبضۂ اقتدار میں تھے اس لیے لوگوں نے اس سے خوفزدہ ہو کر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن خاص جزیرۃ العرب میں تین صاحبِ اقتدار شخص تھے جنہوں نے اس کی خلافت کو کسی طرح بھی منظور نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا فاسق شخص کسی صورت بھی آنحضرتؐ کی پاک گدی کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اُن کو علم تھا کہ ایک ایسا شخص جو کہ فاجر اور زانی ہو مسلمانوں کے خلیفہ بننے کا اہل ہر گز نہیں ہے۔ ان لوگوں میں آنحضرتؐ کی پاک تعلیم کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ انہوں نے خلفائے راشدین کے زمانہ کی طرزِ حکومت خود اپنی آنکھوں سے

دیکھی تھی اس لیے انہیں دنیا کی کوئی طاقت بھی مجبور نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی اطاعت کریں۔ جس کو اسلام سے کوئی مس نہیں ہے اس کے حلقہ بگوش ہوں، جو کہ کافروں سے بھی بد تر تھا اس کو امیر المومنین مانیں، جو کہ فسق و فجور کا پتلا تھا اس کو نائب رسول اللہؐ منظور کریں، جس میں اس آقائے نامدار کے اخلاق کا ایک شمہ بھی نہیں تھا اس کے ہاتھ میں اس آخری خلافت کی باگ دیں جو کہ زانیوں اور شرابیوں کا داروغہ تھا۔ ان تینوں حریت و آزادی کے علم برداروں میں سے ایک وہ ہستی تھی جس کے نام پر مسلمانوں کی جانیں اور اموال قربان ہیں، جو کہ ہمارے آقا، ہمارے مولا، ہمارے والی کا جگر گوشہ، ان کی دخترِ فرخندہ اختر کا جگر پارہ، مسلمانوں کا سردار، سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ تھا۔ ان کو اس دنیا میں امارت اور وجاہت کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ ہر گز نہیں چاہتے تھے کہ خلیفہ بنیں، اور اگر انہیں خواہش ہوتی بھی تو بجا تھی کیونکہ خلافت اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ وہ مسلمانوں کے آقا تھے، ان کے سردار تھے لیکن انہیں یہی منظور تھا کہ ان کا امیر ایک ایسا شخص ہو جو کہ حقیقی معنوں میں ان کے نانائے نامدار کا متبع ہو، نہ کہ یزید جیسا شخص جو کہ اسلام کے نام سے بیگانہ تھا اور آٹھوں پہر نشہ میں چُور اور زنا میں غرق رہتا تھا۔

جب حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تو اس بے حیا، فاسق اور فاجر نے ایک ایسے طریقہ کے ساتھ انہیں اپنا مطیع کرنا چاہا جس کے ذکر سے قلم کانپتا ہے، جگر پاش پاش ہوتا ہے، ہاتھوں میں رعشہ ہوتا ہے، سر چکراتا ہے، طاقت نہیں کہ اُسے بیان کیا جائے۔ اس نے حریت و آزادی کا خون کر دیا اور جگر گوشۂ رسول اکرم اور ان کے معصوم بچّوں کو قصّابوں کی طرح ذبح کیا۔ اُس فرزند رسولؐ کے حلق پر چُھری چلائی جو کہ حضورؐ کے بوسوں کی آماجگاہ تھی۔ اس متبرک جسم پر گھوڑے دوڑائے جس جسم اطہر کا گھوڑا دنیا کے شہنشاہ کی پشت تھی۔ اس جسّم مبارک کو کچل ڈالا جس کی پرورش سیّد النّسا کی مبارک گود میں ہوئی تھی۔

ہندوستان میں ہی کئی ایک ایسے لوگ ہیں جو کہ قتل حسینؑ کو واجب قرار دیتے ہیں اور یزید کے فعل کو جائز کہتے ہیں۔ وہ غور کریں اور حسینؑ کے مرتبہ اور شان کو دیکھیں۔ وہ کون تھے؟ کس باپ کے فرزند تھے؟ کس ماں کے لاڈلے تھے؟ کس نانا کے جگر گوشہ تھے؟ کس نامور ہستی کے بھائی تھے؟ وہ مطالعہ کریں، انہوں نے کس گودی میں پرورش پائی تھی اور پھر کس مظلومیت میں قتل کیے گئے۔

او ناقدر شناس مسلمانو! غور کرو اور سوچو۔ ایک ایسے شخص کی حمایت کرتے ہو جو کہ اسلام کا دشمن، حریت و آزادی کا عدو، مسلمانوں کا حاسد، اور خاندان نبوت کا تباہ کرنے والا تھا۔ کیا دنیا سے انصاف اُٹھ گیا ہے؟ کیا عدل

کانام ونشان ہی مٹ گیا ہے؟ حسینؑ میں کونسا نقص دیکھتے ہو جو ان کے مقابلہ میں ایک فاسق کی حمایت کرتے ہو۔ کیا انہوں نے اسلام کی استقامت کے لیے اپنی گردن نہیں کٹوائی؟ کیا مسلمانوں کی حریت اور آزادی کے قائم رکھنے کے لیے اپنے جسم کے ٹکڑے نہیں کروائے؟ انصاف کرو اور سوچو کہ وہ نبیرہ رسول اللہؐ تھے۔ وہ تمہارے اس آقائے نامدار کے فرزند تھے جنہوں نے تمہارے لیے بہشت کی بشارت دی، جنہوں نے تمہیں آزادی دلوائی اور غلامی کا طوق تمہاری گردنوں سے اتارا، جنہوں نے تمہیں دنیا کا سردار بنایا پھر انہیں کی اولاد کے دشمن ہو رہے ہو اور انہیں کے اہلبیت کا قتل جائز قرار دیتے ہو۔ ان کے مظلوم بچے پیاس سے تڑپ رہے ہوں اور تم خوش ہو۔ ان کی بیویاں اور لڑکیاں بے عزت کی جائیں اور تم ہنسو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کچھ تو لحاظ رکھو، کچھ تو پاس کرو۔ قیامت کے روز اپنے آقا کو منہ دکھانا ہے۔ ایک تو اس ظالم (یزید) نے آنحضرتؐ کی اولاد کے خون بہائے اور پھر تم اس خون کو جائز کر کے اپنا روسیاہ کرتے ہو۔ آؤ باز آؤ، خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔

حسینؑ نے اپنا سر کٹوا کر تمہارے لیے ایک ایسی مثال دنیا میں چھوڑی جس سے تم وہ وہ سبق حاصل کر سکتے ہو کہ تمہاری آیندہ زندگی نہایت ہی زریّں بن سکے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر تمہاری آزادی غارت ہو رہی ہو، تمہارا مذہب تباہ ہو رہا ہو، تمہاری ہستی نابود ہو رہی ہو، تمہیں غلام بنایا جا رہا ہو، تمہارا ایمان برباد جا رہا ہو، تمہارے اموال کی غارت گری ہو رہی ہو تو تم کیا کرو۔ اپنی جانوں، مالوں، بیوی بچّوں اور خویش واقربا کی کچھ پرواہ نہ کرو اور اپنے ایمان کے آگے ان سب کو ہیچ خیال کرو۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا میں تمہیں ایسے مواقع پیش آنے والے ہیں، اور اس قسم کی مصیبتیں واقع ہونے والی ہیں کہ تمہارا مذہب برباد کیا جائے گا اور تمہیں غلام بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن خبردار! یہ کبھی بھی گوارا نہ کرنا کہ اپنا ایمان ضعیف کر لینا اور ظالموں کے قبضہ میں اپنے آپ کو دے کر اپنے پاک مذہب پر بٹہ لگا دینا۔ بلکہ اگر ایسی بات ہو تو کیا کرنا، میری طرح اپنی جانوں کو قربان کر دینا، اپنے بال بچّوں کو اپنے سامنے ذبح ہوتے دیکھ کر چون وچرا نہ کرنا، اپنا مال اپنی موجودگی میں لٹوانا۔ تمہارا ایمان بالکل متزلزل نہ ہو، تمہیں دنیا کی محبّت بالکل قابو میں نہ کر لیں، تمہاری اولاد تمہیں دنیا کی چندروزہ محبّت میں نہ ڈال دے۔

جس طرح آنحضرتؐ نے ہجرت کر کے تمہیں دکھلایا کہ اس وقت جبکہ تمہارا وطن بھی تمہارا دشمن ہو جائے تو تم کیا کرو، اسی طرح حسینؑ نے اپنی گردن کٹوا کر تمہیں بتلایا کہ جب ظالم تمہیں غلام بنانا چاہیں تو تمہیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ حسینؑ کا قتل خدائے تعالیٰ کی مشیّت تھی۔ تمہارے آقا کے پاک فرزند کو تمہاری

آزادی کے بھینٹ چڑھایااور تمہیں بتایا کہ تمہاری ہستی دنیامیں کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ اگرچہ یزید علیہ العنۃ کے طرزِ عمل نے ہمیشہ کے لیے اسلام کی آزادی کا خاتمہ کر دیا لیکن اس میں بھی تمہاری آزادی کے قائم رکھنے کا ایک زریّں اصول تھا۔

اسلام ایران و عرب و شام، مصر اور روم تک پھیلا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ کے نام لیوا ان ملکوں کے گوشہ گوشہ میں پائے جاتے تھے۔ اس وقت وہ لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کی فیض صحبت کا لطف اٹھایا ہوا تھا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے حسینؑ کا لاڈ دیکھا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے فرزند ہیں، فاطمہ بنت رسول اللہؐ کے جگر گوشہ ہیں، لیکن کیا حال تھا، اس فرزند نبی کے قتل پر ایک فاسق کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہی لوگ اس وقت آپ کے اہلبیت کی مصیبتوں کو دیکھتے، بچّوں کو پیاس سے بلکتا پاتے اور خوش ہوتے۔ وہ جس کی حمایت پر کھڑے تھے اس کو جانتے تھے کہ وہ اسلام میں بدترین انسان ہے لیکن اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ سچ ہے، داناؤں نے کیا اچھا کہا ہے، دوست و دشمن کی پہچان مصیبت کے وقت ہوتی ہے۔ اس امتحان نے بتلا دیا کہ کون دشمن ہے اور کون دوست ہے۔ ایک مظلوم اور وہ بھی سرور کائناتؐ کا نواسہ بمعہ فرزندوں اور عورتوں کے ایک لق ودق میدان میں کھڑا رہے، وہی مسلمان جو کہ کلمہ گو کہلاتے ہیں اس کو ایک قطرۂ آب پیاس بجھانے کے لیے نہیں دیتے۔ جانور، چرند، درند و پرند پانی پیتے ہیں لیکن اگر اجازت نہیں تو جگر گوشۂ رسول اللہؐ کو پانی لینے کی اجازت نہیں۔ معصومین العطش العطش پکار رہے ہیں لیکن کسی کو بھی رحم نہیں آتا۔ کوئی بھی خیال نہیں کرتا کہ یہ اس کی اولاد ہیں جو کہ ابھی ابھی ہمارے درمیان تھا۔ جس نے ہمارے لیے دنیا میں راحت اور آخرت میں نجات کے اسباب مہیا کیے، جو کہ ہمیں آزادی دلوانے والا تھا اور جس نے ہمیں ابدی آرام کا راستہ بتلایا۔

ان مسلمانوں نے اس فرزند رسولؐ کے بچّوں کو قتل کیا، لڑکوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، چھوٹے چھوٹے معصوموں کے حلقوں پر تیر چلائے، اور آخر کار اس کو بھی نہایت بے بسی کی حالت میں شہید کر ڈالا۔

غور کرو، وہ نبیرۂ رسول اکرم فرزند علی ابن ابیطالبؑ میدان جنگ میں آتا ہے اور کس طرح ان لوگوں کو جو کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جن کے دل سیاہ ہیں مخاطب کرتا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو ملاحظہ کرو اور پھر سوچو کہ وہ لوگ اس سے کس قسم کا سلوک کر رہے تھے اور اس مظلوم کو ناحق ظلم و ستم کا شکار بنا رہے تھے۔ وہ راست باز انسان کسی کا مزاحم نہیں تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اپنی زندگی گوشہ تنہائی میں بسر کرے لیکن

ان لوگوں نے اس کو کسی طرح آرام نہ لینے دیا۔

جب حسینؑ یزیدی فوج کے بالمقابل ایستادہ ہوئے تو آپ نے خدائے عزوجل کی حمد وثنا اور حضرت محمد رسول اللہؐ پر دُرود بھیجنے کے بعد اس کو بدیں الفاظ مخاطب کیا:

''اے لوگو تم میں سے وہ مجھے جانتا ہے اور وہ جو نہیں جانتا چاہیے کہ جان لے۔ میں رسول اللہؐ کا نواسہ وصی اللہ یعنی حضرت علیؓ ابن ابیطالبؓ کا فرزند اور فاطمۃ الزہرا کا پسر ہوں۔ جو سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے وہ میرے والد علیؓ اور میرے چچا جعفر طیار تھے۔ کس کو ایسے والدین کے فرزند ہونے کا فخر حاصل ہے جیسا کہ مجھے ہے۔ تم جانتے ہو کہ حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا ''حسن و حسین علیہم السلام اہل جنّت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔'' علاوہ ازیں میرے برادر اور مجھ پر بہشت نے گواہی دی تھی۔ اگر میری بات کو سچ نہیں مانتے ہو تو جانو کہ میں بالیقین جانتا ہوں کہ خدائے عزوجل کے نزدیک جھوٹ بولنا حرام ہے۔ میں نے حرام نہیں کھایا اور نہ کبھی وعدہ خلافی کی۔ میں نے کبھی کسی مومن کو تکلیف نہیں دی اور نہ ہی میں نے کبھی کوئی نماز ترک کی ہے۔ اگر میری باتوں کا تمہیں یقین نہیں ہے تو اس وقت بھی سرور کائناتؐ کے بہت سے صحابہؓ زندہ ہیں جنہوں نے میری نسبت آپ کی زبان مبارک سے سُنا ہے، تم ان سے پُوچھ سکتے ہو۔ اگر عیسیٰؑ کا گدھا عیسائیوں میں موجود ہوتا تو وہ اس کی قیامت تک پرورش کرتے اور اس کو کسی طرح نہ چھوڑتے کہ زمین پر فنا ہو جائے۔ اور اگر یہود کے پاس حضرت موسیٰؑ کی کوئی نشانی ہوتی تو وہ بھی اسی طرح اس کی عزت اور تکریم کرتے۔ تم کس قسم کے لوگ ہو کہ اپنے پیغمبرؐ کے فرزندوں، بچّوں اور دختروں کو پکڑ کر ان کے قتل کا ارادہ رکھتے ہو۔ تم اللہ جل شانہ سے خوف کھاتے ہو اور نہ سرور کائناتؐ سے شرم رکھتے ہو۔ میں نے کبھی بھی عمر بھر میں کسی کا خون نہیں گرایا ہے اور کسی کے مال تک کو نہیں چُھوا ہے، اور اس سبب سے تمہیں مجھ پر کسی کے قصاص کا حق حاصل نہیں ہے۔ تو پھر تم مجھے کس لیے قتل کرتے ہو اور میرے خون کو حلال جانتے ہو۔ میں تو اس قسم کا آدمی تھا کہ دنیا سے گوشہ نشین ہو گیا تھا اور اپنے نانائے محترم کی قبر مبارک پر مجاوری کرتا تھا۔ مجھے تم نے وہاں بھی نہ چھوڑا اور بُلا بھیجا۔ پس اب میں مکّہ معظمہ کی طرف جاتا ہوں اور عبادت الٰہی میں مشغول ہوتا ہوں۔

اواہل کوفہ! تم نے مجھے خطوط لکھا کر بُلا بھیجا کہ ہم تجھے خلافت کا حق دار جانتے ہیں اور تیری بیعت کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن جب میں آیا تو تم نے غدر کیا۔ مگر میں آج تمہیں وہی کہتا ہوں جو کچھ موسیٰؑ نے فرعون سے کہا تھا۔ ''میں پروردگار سے اپنے اور تمہارے لیے رحمت مانگتا ہوں۔'' میری اس قدر رعایت کرو اور مجھے قتل

نہ کرو اور مجھ سے دُور رہو کہ میں خانہ کعبہ کی طرف چلا جاؤں یا اپنے نانا کی قبر پر بیٹھ جاؤں، یہاں تک کہ دنیا سے گزروں اور اس جہاں سے دُوسرے جہاں میں پہنچوں اور پھر وہاں معلوم ہو کہ حق پر کون تھا۔''

جب انہوں نے آپ کی یہ تقریر سُنی تو بالکل خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر تھوڑی دیر کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''الحمد للہ میں نے حجت پوری کر دی۔'' پھر ایک ایک کو آپ نے آواز دی۔ ''اے شیث ابن ربعی اور اے حجاج ابن الحسن اور اے قیس ابن الاشعث اور اے حُرّ ابن یزید اور اے فلاں فلاں کیا تم نے مجھے خطوط نہیں لکھے تھے اور مجھے نہیں بُلایا تھا، اور آج جبکہ میں آگیا ہو تو مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہو۔''

انہوں نے کہا، ''ہم نے کوئی خط نہیں بھیجا۔'' حضرت امام حسینؑ نے اپنے خزانچی کو بلایا اور حکم دیا کہ ان لوگوں کے خطوط نکال لائے۔ پھر آپ نے ایک ایک کا خط علیحدہ علیحدہ پڑھا لیکن ان لوگوں نے کہا ''ہم بیزار ہیں۔''

غور کرو، کیا ہی جگر دوز تقریر ہے جس کے ایک ایک لفظ سے صداقت اور سچائی ٹپکتی ہے۔ کوئی بات بھی آپ نے خلافِ واقعہ نہیں فرمائی لیکن چونکہ ان لوگوں کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی تھیں اس لیے ان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ افسوس! اب بھی وہ لوگ خیال کریں جو یزید کو حق بجانب کہتے ہیں اور توبہ نعوذ باللہ امام حسینؑ کو باغی قرار دیتے ہیں امام مظلوم کے الفاظ صاف طور سے بتا رہے ہیں کہ وہ کسی کے مزاحم نہیں ہوتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ سرور کائناتؐ کے مزار مبارک پر بیٹھ کر اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن بسر کریں۔ لیکن دشمنان رسول اللہؐ نے آپ کو نہ چھوڑا اور قتل ہی کیا۔ ان ستم پیشہ لوگوں نے اسی پر ہی بس نہ کیا بلکہ آپ کے قتل کے بعد بیویوں کو لوٹا، ان کے مال و اسباب کو غارت کیا ان کی پردہ دری کی، اور ان کے سروں پر سے دوپٹے اتار ڈالے۔ غرضیکہ وہ کچھ کیا جو کہ دشمن کے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اگر امام حسینؑ باغی تھے تو ان عفت مآب بیویوں نے کیا لیا تھا۔ اگر امام حسینؑ نے سرتابی کی تھی تو ان پاک دامن عورتوں نے یزید کا کیا بگاڑا تھا۔ اگر حسینؑ اسے خلیفہ تسلیم نہیں کرتے تھے تو ان حرم کی محترم مستورات نے اس کو کونسی تیغ ماری تھی۔ وہ خاندانِ نبوت کی عصمت مآب عورتیں تھیں۔ اس خاندان کی عورتیں تھیں جو کہ سرور کائناتؐ کا خاندان تھا اور اہلبیت کہلاتا تھا، جس کے لیے بوقت وفات حضورؐ فرما گئے تھے۔ ''میں اہلبیت کو اپنے پیچھے چھوڑتا ہوں، اس کی عزت کریو۔'' کیا پھر تم نے اس کی عزت کی؟ اپنے پیارے نبیؐ کے الفاظ کا پاس کیا؟ ان کے ارشاد کی توقیر کی؟ افسوس صد افسوس تمہاری ہستی پر، اس بل پر جنتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، اسی بات پر مومن کہلاتے ہو۔ یاد رکھو، تم نے خاندانِ نبوت پر

وہ وہ ظلم کیے کہ قیامت کے روز تمہارے چہرے سیاہ ہوں گے اور آتشین لباس تمہارے زیب بدن ہو گا، اور اس وقت پھر حق اور ناحق کا فیصلہ ہو گا۔

# دسویں فصل

## جانشینانِ معاویہ

### حشر خلافت

ایک صاحب اُم المومنین حضرت ام حبیبہؓ کی شان مبارک میں صفاتی کلمات بیان کرتے ہوئے معاویہ اور ان کے جانشینوں کی بڑائی میں یوں گوہر افشانی کرتے ہیں۔ ''اُم حبیبہؓ اس معزز باپ کی بیٹی ہیں جو عرب میں بحیثیت جاہ، مرتبہ، اولوالعزمی کے اپنے زمانہ میں سب سے ممتاز شخص تھا، یعنی ابو سفیان ابن حرب۔ یہ وہ شخص تھا جس کے بیٹے حضرت امیر معاویہ اور جس کے اخلاف کے ہاتھوں میں صدیوں تک خلافتِ اسلام کی باگ رہی اور جنہوں نے اولوالعزمی اور بہادری سے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے وہ جان توڑ کوششیں کیں جو اسلام کے صفحاتِ تاریخ پر سورج کی طرح چمکتی رہیں گی۔ ان لوگوں نے نہ صرف مشرقی ممالک میں اسلام کو فروغ دیا بلکہ یورپ اور افریقہ کے گنجان جنگلوں اور تاریک غاروں کو بھی اس کے نور سے منور کر دیا۔ اسپین (اندلس) کی زبردست سلطنت انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ قرطبہ انہی کا پایہ تخت تھا جو تمام عالم کے طلاب علوم کا صدیوں تک مرکز بنا رہا۔

''ابو سفیان جو سینکڑوں اسلامی خلفاء کا پر شان دادا ہے، بنی امیّہ کا جو تمام عرب میں سب سے بڑا طاقتور قبیلہ تسلیم کیا جاتا تھا، سردار تھا۔ شاہانِ فارس اور رُوم کے درباروں میں اس کی بڑی عظمت تھی۔ رسول اللہؐ نے جب رسالت کا دعویٰ کیا تو اس شخص کی مخالفت نے ان کی مبارک کامیابیوں میں بہت کچھ رُکاوٹ ڈال رکھی تھی اور اُحد وغیرہ کی مشہور لڑائیاں آنحضرتؐ انہیں کے ساتھ لڑے تھے۔ اور جب یہ مسلمان ہو گئے تو یہ خود اور ان کے معزز بیٹے امیر معاویہ اور یزید ابن ابی سفیان وغیرہ نے اسلام کی ویسی خدمت بھی کی جیسی اس کی مخالفت کی تھی۔''

یہ بالکل درست ہے کہ معاویہ اور ان کے جانشینوں کے عہد میں اسلامی فتوحات بہت بڑھ گئی تھیں اور مسلمانوں نے افریقہ کے شمالی علاقوں کے فتح کرنے کے ساتھ ہی اسی زمانہ میں ہسپانیہ کو بھی حلقہ بگوش اسلام کر لیا تھا۔ لیکن ہم نے دیکھنا ہے کہ اس پاک تعلیم کی پیروی کس حد تک کی گئی تھی جو کہ آنحضرتؐ کی فیض

صحبت اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے ہمیں حاصل ہوئی تھی۔ اسلام کا منشا یہ نہیں تھا کہ بہت سے دیار اور امصار خلافت کے قبضہ میں ہوں، اور لاتعداد بندگانِ خدا غلامی کا پٹہ اپنی گردن میں ڈال کر فرعون منش خلفاء کے آگے اپنا سر خم کرتے ہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ نہایت ہی زہد اور تقویٰ کے ساتھ اُس کی فتوحات کو وسعت دی جائے اور وہ لوگ جو اس کے حلقۂ اطاعت میں ہوں نہایت ہی فارغبالی، آرام و آسایش اور عدل و انصاف کے سایہ کے نیچے اپنی زندگی بسر کریں، اور خلیفۂ وقت اور اس کے ہمنواؤں کی زندگی کی روش اس قسم کی ہو کہ دوسروں کے لیے نمونہ کا کام دے۔ اسلام کا مدعا ہی یہ ہے کہ روحانیت کو ترقی دیتے ہوئے اس دنیا میں ایسا تمدّن قائم کیا جائے جو کہ نظامِ عالم کے لیے نہایت ہی موزوں ہو۔ خدائے عزوجل نے اس آخری خلافت کو صرف اسی لیے قائم کیا کہ وہ خرابیاں جو انسانی تمدّن اور معاشرت میں واقع ہو رہی تھیں مٹادی جائیں، اور وہ افعالِ ذمیمہ جو انسانوں سے سرزد ہو رہے تھے ان کا اس طریقہ کے ساتھ قلع قمع کیا جائے کہ پھر ان کا نام و نشان تک نہ پایا جائے۔ خلیفہ کے فرائض میں یہ بات نہایت ہی وثوق کے ساتھ داخل تھی کہ وہ لوگوں کے افعال کا نگران ہو اور اس خدائی قائم کردہ تمدّن میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کی اجازت نہ دے۔ اور اگر وہ کسی قسم کے جرائم کے مرتکب ہوں تو شریعت اسلامی کے مطابق ان سے باز پُرس کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی بنیاد صرف اسی لیے رکھی تھی کہ دنیا کا انتظام قائم رہے اور اس کے قرار دیئے ہوئے اصول اور قوانین بوجوہ احسن عملی صورت میں لائے جا سکیں۔ اس نے قرآن مجید کے ذریعہ چند ایک احکام اوامر و نواہی سرور کائناتؐ کی وساطت سے لوگوں کے لیے صادر فرمائے، اور انہیں وعدہ دلایا کہ اگر وہ ان پر عملدرآمد کریں گے تو انہیں بڑے بڑے انعام دیئے جائیں گے، اور اگر فواحشات اور منکرات سے باز نہیں رہیں گے تو انہیں سزا دی جائے گی۔ لیکن چونکہ لوگوں کے طبائع ایک ہی قسم کے واقع نہیں ہوئے ہیں اس لیے ممکن ہے کہ عامۃ الناس ایک ہی طریقہ سے اور ایک ہی وقت میں ان احکام کی پیروی نہ کر سکیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن پر ان احکام کا پورے طور سے اثر ہوتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر بہت کم اثر ہوتا ہے، اور اس لیے ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان افعال قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں جن کی اللہ جل شانہ نے مخالفت فرمائی ہے تو بدیں صورت ان کا کیا اثر ہوتا ہے۔ وہی تمدّن جو کہ خدائے عزوجل نے نظامِ عالم کے لیے قائم کیا ہوا ہے بگڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نقص کے دُور کرنے کے لیے ربّ العزت والدین نے اپنی طرف سے ایک نگران کی تقرری کی جسے ہماری اصطلاح میں ''خلیفہ'' کہتے ہیں اور جس کے فرائض میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ اس کے احکام لوگوں

کے درمیان جاری کرے، اور جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان کے کرنے سے لوگوں کو باز رکھے تاکہ نظامِ عالم بگڑنے نہ پائے۔ چنانچہ بدیں اسباب ضروری ہے کہ خلیفہ اس قسم کا ہونا چاہیے جس کے اخلاق نہایت ہی پاکیزہ ہوں اور اس میں وہ باتیں پائی جائیں جو رعایا کے لیے نمونہ کا کام دے۔ وہ امر بالمعروف پر کاربند اور نہی عن المنکر سے پہلو تہی کرنے والا ہو، اور اس میں وہ صفات پائی جائیں جو کہ دوسروں کے لیے رہنمائی کا کام دیں۔ اور اگر خود اس سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں تو بہ مصداق ''او کہ خود گمراہ است کرا رہبری کند'' ہر گز ہر گز نظام عالم کے قائم اور برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہو گا۔

چنانچہ اسی خیال کے مطابق ہم نے دیکھنا ہے کہ بنی امیّہ کے خلفاء کا طرز عمل کیا رہا ہے، اور اگر وہ خود شریعت اسلام کی پیروی خلفائے راشدین کی طرح کرتے تھے تو گویا وہ حقیقی معنوں میں مسلمانوں کے خلفاء تھے۔ اور اگر وہ خود ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے جو کہ شریعت کے خلاف تھے تو ہم کسی صورت بھی کہنے کے لیے تیار نہیں کہ وہ خلفائے اسلام کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ترقی اور اشاعتِ اسلام کے بہانہ کو مدِّ نظر رکھ کر اپنی مملکت کو وسیع کر لیا ہوا تھا۔ اس میں اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ قاعدہ ہے کہ انسان کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے اتنا ہی وہ زیادہ حریص ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی وسیع فتوحات نے انہیں اور زیادہ فتوحات کے وسیع کرنے پر حریص کر دیا ہوا تھا۔ اگر خلیفہ کی وفات سے لوگوں کو روحانی فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ بہت سے ملک اس کے قبضۂ اقتدار میں ہوں اور الحاد، فسق اور فجور اس کا شیوہ ہے۔

ہمارے خیال میں مسلمانوں کے تنزل کے اسباب میں ایک یہ بات بھی داخل ہے کہ انہوں نے ایک طرف تعصّب اور دوسری طرف حرص اور آز کی وجہ سے ان خلفاء کی بھی جو کہ کسی طرح حقیقی معنوں میں خلیفہ کہلانا کا استحقاق نہیں رکھتے ہیں، نہایت ہی مبالغہ آمیز الفاظ میں مدح سرائی کی ہے۔ ان کی شان میں ایسے لمبے قصاید پڑھے جاتے ہیں جن سے اُن کی دنیاوی شان و شوکت کی تعریف تو نکلتی ہے لیکن تعلیم اسلامی کا ایک نمونہ بھی ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ فی زمانہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ مسلمانوں میں تعصّب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلاں فلاں خلفاء کا کیا طرز عمل رہا ہے اور ان کی ہستی کس حد تک اسلام کے لیے فائدہ مند اور اس کی روایات کے ساتھ مطابقت رکھنے والی رہی ہے۔ لیکن چونکہ انہیں ایک فریق مقابل کو زک دینی ہوتی ہے اس لیے ہر قسم کے جائز اور ناجائز دلائل سے ان (خلفاء) کی حمایت کرتے ہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک وہ اس قسم کی روش ترک نہیں کریں گے کسی طرح بھی اسلام کی ترقی نہیں ہو سکے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہایت ہی سادگی اور لطافت کے ساتھ حقیقت کا انکشاف کیا جائے اور ہٹ دھرمی اور ضد کو چھوڑ کر انصاف سے کام لیا جائے۔ جب تک وہ اس قسم کا طرز عمل اختیار نہیں کریں گے ہمیں مسلمانوں کی ترقی کی طرف سے مایوسی ہی مایوسی ہے۔ اس زمانہ میں اکثر مسلمانوں کو دیکھا گیا ہے کہ دیدہ و دانستہ حقیقت کو چُھپا کر محض خوشامدانہ طور سے ایسی ایسی لغو باتیں بناتے ہیں جو کہ اسلامی تعلیم کے منافی ہیں اور نفس اسلام کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ہیں اکثر ایسے ایسے علاّمہ بزرگوں کے حالات سننے میں آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے طرز عمل سے اسلام کی ایسی گت بنائی ہے جس کا اگر تذکرہ کیا جائے تو کلیجہ شق ہونے کا خطرہ ہے۔

خیر یہ تو ایک قسم کی تمہید تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے دیکھنا ہے کہ آیا معاویہ کے جانشینوں سے اسلام کو نفع پہنچا یا کہ نقصان، اور خلافت کی وہی صورت رہی جس کی بنیاد آنحضرتؐ نے رکھی اور خلفائے راشدین نے اس کی عمارت کو کھڑا کیا، یا کہ اس کے بالکل اُلٹ معاملہ تھا۔ ہم نے کسی گذشتہ فصل میں روایتہ و درایتہً معاویہ کے طرز عمل اور ان کی روشِ زندگی پر تنقید کر کے ناظرین کو دکھلایا کہ ان کی ہستی نفس اسلام کے لیے کس قدر خطرناک تھی۔ جو کچھ حصولِ خلافت اور استحکام خلافت کے متعلق ان کی روش رہی ہے وہ کس درجہ جائز تھی۔ اب ہم تاریخی واقعات کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ اگر معاویہ میں کسی قدر سرورِ کائناتؐ کی پاک تعلیم اور فیض صحبت کا اثر پایا جاتا تھا جس کے باعث وہ فسق و فجور سے بری تھے، تو ان کے جانشینوں نے اس معاملہ میں حد ہی کر دی۔ انہوں نے خلافت کو اپنے گھر کی ملکیت تصور کرتے ہوئے دنیا کی تمام لغویات اور بیہودہ باتوں کو اپنی ذات کو مرجع بنایا ہوا تھا۔ اسلام نے اگر پابندی صلوٰۃ کا حکم دیا ہے تو نہوں نے اس کی کچھ بھی پرواہ نہیں کی۔ اسلام نے اگر خون ناحق کو ناجائز قرار دیا ہے تو انہوں نے اپنے مدعا کے حصول کے لیے سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہوں کے خون گرائے۔ اسلام نے آنحضرتؐ کے اہلبیت کی عزت کی تاکید کی ہے تو انہوں نے چُن چُن کر ان کو مارا۔ اسلام نے اگر شراب کو ام الخبائث کا لقب دیا تو انہوں نے اس کو ام الطیّبات کے نام سے یاد کیا۔ اسلام نے اگر زنا کی شدومد کے ساتھ مذمّت کی ہے تو انہوں نے نہایت فارغبالی کے ساتھ اس میں لذّت اٹھائی۔ اسلام نے اگر ظلم و ستم کا قلع و قمع کیا ہے تو انہوں نے اس کو اپنی سرخروئی اور آبادانی کا ذریعہ سمجھا۔ غرضیکہ جو جو باتیں اسلام کی تعلیم کے خلاف تھیں انہوں نے اس کو خوب خوب رواج دیا۔

گذشتہ فصل میں آپ نے یزید ابن معاویہ کی سفاکیوں کا ایک معمولی سا نقشہ ملاحظہ کیا ہے۔ اس سیہ کار انسان

کے لیے یہی ایک واقعہ (واقعہ کربلا) تاقیامت لوگوں کی زبانوں سے لعنت کی بوچھاڑ اس پر ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن چونکہ بعض لوگ اس کی اس کارروائی کو سیاسی وجوہات پر محمول کرتے ہیں اس لیے ہم اس سے درگزر کرکے اس کے دیگر افعال پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اس شخص کی زندگی ہی نیک لوگوں کو تباہ و برباد کرنے، حرمِ محترم کی بے حرمتی کرنے، خانہ کعبہ کی توہین کرنے، سفّاکی کو کام میں لانے، اور فسق و فجور کو اپنا شیوہ بنانے میں گزری ہے۔ اگر اس کی سیہ کاریوں میں کوئی شک کرتا ہے تو گویا اس کو واقعاتِ تاریخ سے کسی قسم کا مس نہیں ہے۔ اس کے قابلِ الزام طرزِ عمل کے متعلق طبریؒ جیسے علامہ مؤرخ کی شہادت ان لوگوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے جو اس کی حمایت میں کمربستہ ہونے کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ صرف خود ہی شراب خور اور سفّاک نہیں تھا بلکہ اس کے خاندان والے اور ہم صُحبت بھی ان عیوب میں یدِ طولےٰ رکھتے تھے۔

امام حسینؓ کے قتل کے بعد مدینہ کا والی اس کے چچا کا لڑکا عثمان ابن محمد ابن سفیان تھا۔ یہ شخص پرلے درجہ کا شراب خور تھا۔ اس نے اہلبیت کی تباہی کے بعد مدینہ منوّرہ کے بہت سے معززین کو جن میں بڑے بڑے دیندار لوگ شامل تھے اس لیے دمشق روانہ کیا کہ وہاں وہ یزید کی شان و شوکت دیکھ کر مرعوب ہوں اور اس کی اطاعت سے سر نہ موڑیں۔ چنانچہ جب وہ بزرگ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کا حال کافروں سے بھی بدتر ہے۔ اسلام کی اُسے کچھ بھی پرواہ نہیں، کتوں میں ہر وقت مشغول رہتا ہے، اور عیش و عشرت اور لہو و لعب سے ایک دقیقہ کے لیے بھی اسے فرصت نہیں ملتی۔ اگرچہ یزید نے ان کی حد سے زیادہ خاطر و مدارات کی لیکن مدینہ کی طرف لوٹنے کے بعد انہوں نے اسلام کی پاک تعلیم کے اثر کے باعث اظہارِ حق سے پہلو تہی نہ کی اور برملا کہہ دیا کہ یزید کو خلافت کا کچھ حق نہیں اور ہم لوگ کسی صُورت بھی اُس کی بیعت نہیں رکھ سکتے اس لیے کہ اُس میں مسلمانوں کے امیر بننے کا کوئی وصف بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر کیا تھا، سارے کا سارا مدینہ اس کے خلاف ہو گیا اور لوگوں نے تمام بنی امیّہ کو گرفتار کرکے ایک گھر میں بند کر دیا، اور عبداللہ ابن حنظلہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ لیکن غلطی یہ کی کہ عبدالملک ابن مروان کو جو کہ اس زمانہ کے نہایت ہی جیّد عالم اور فقیہی سعید ابن المسیب سے علم دین حاصل کرتا اور ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا، اس گرفتاری سے مستثنےٰ کر دیا۔ اس عابد اور زاہد نے کیا گل کھلایا کہ تمام حالات سے یزید کو آگاہ کر دیا۔ جب یزید کے پاس قاصد پہنچا تو اس نے فوراً ہی مدینہ کی طرف بہت سی فوج روانہ کر دی تاکہ ان لوگوں کو بزورِ شمشیر مطیع کیا جائے۔ یہ وہ مدینہ تھا جہاں سے نہایت ہی شان و شوکت کے ساتھ لشکر اسلام کفّار کے مطیع کرنے اور اسلام کی اشاعت کے لیے روانہ ہوا کرتا

تھا۔ یہ وہی مدینہ تھا جہاں نبیؐ کے قدمِ مبارک اپنی بابرکت موجودگی سے اس سرزمین کو شرف بخشتے تھے اور جہاں وہ نبی آخر الزماں خوابِ راحت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ وہی مدینہ تھا کہ دنیا میں امان کی جگہ تھی اور جن کے نام سے دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ کانپتے رہتے۔

آہ! آج وہی مدینہ ان لوگوں کے ہاتھوں پامال ہونے والا ہے جو مسلمان کہلاتے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہؐ کی اُمّت میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مدینہ والوں کا کیا قصور ہے کہ اُن کی گردنوں پر تلواریں چلائی جانے والی ہیں۔ یہی ہے کہ وہ اس بات پر معترض ہیں کہ خلیفہ زانی، شرابی، فاسق اور فاجر نہیں ہونا چاہیے بلکہ حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل کی پیروی کرنے والا ہو، اور صحابہؓ جیسا ایمان رکھتا ہو، آنحضرتؐ کی سنت کا متبع ہو۔ کیا وہ اس اعتراض کے سبب قابل الزام ٹھہر سکتے ہیں؟ کیا اسلام نے انہیں آزادی نہیں دی کہ اگر وہ خلیفہ کو خلافِ شرع کام کرتے دیکھیں تو اس سے باز پرس کریں؟ افسوس اتنی جلدی ہی مسلمانوں نے اسلام کی پاکیزہ تعلیم فراموش کر دی اور یزید جیسے بے حیا انسان کے ساتھ مل کر پہلے اپنے آقائے نامدار کے نواسوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اب آنحضرتؐ کے مقدس شہر اور مسکن کو تہ تیغ کرنے پر پل پڑے۔

جب یزیدی فوج مدینہ منورہ پہنچی تو مدینہ والوں نے بھی نہایت ہی مستعدی اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، لیکن آخر کار ہزیمت اُٹھائی اور نتیجہ یہ ہوا کہ شامی فوج نے شہر میں داخل ہو کر قتل و خون اور غارت گری شروع کر دی۔ ان کے سپہ سالار نے حکم دے دیا کہ مدینہ والوں کا خون و مال شامیوں پر حلال ہے اور تین یوم تک انہوں نے ظلم و ستم کے وہ جوہر دکھلائے کہ خدا کی پناہ! آنحضرتؐ کے بڑے بڑے صحابہؓ بھی اس وقت زندہ تھے۔ ان میں سے بچ بچا کر کوئی کسی طرف چلا گیا اور کوئی کسی طرف راہی ہوا۔ وہ پاک سرزمین جو کہ اسلام کی مرزبوم تھی کس طرح فوج یزید کے ہاتھوں ناپاک ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بنی امیّہ کے اسلام پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ ہمیں تو سوائے ان کے اور کوئی بھی معلوم نہیں ہوتے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ انہوں نے اسلام کی تباہی کے کیا کیا سامان بہم نہیں پہنچائے۔ انہوں نے اپنے آقا سرورِ کائناتؐ کے خاندان کو کس طرح تباہ نہ کیا۔ انہوں نے مدینہ منورہ کو کس طرح برباد نہ کیا، اور اسلام کو انہی کے ہاتھوں کیسے کیسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

یزید کی سفاکیوں اور حرام زدگیوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ خاندانِ نبوّت کی تباہی اور مدینہ منورہ کی پائمالی کے بعد مکّہ معظمہ باقی رہ گیا تھا، اور اب اس کے لیے ضروری تھا کہ اس مقدس زمین کو بھی اپنی سفاکیوں کی جولان گاہ

بنائے کیونکہ اگر وہ اس مقام کو اپنے شرمناک کارناموں سے بے نشان رکھتا تو قیامت کے روز اس سے باز پرس ہونی تھی کہ اس نے خانۂ خدا کو اپنی نامبارک یادگار سے کس لیے محروم رکھا۔

مدینہ میں فیصلہ کر کے اب شاہی لشکر مکہ معظمہ کی طرف کوچ کر گیا جہاں عبداللہ ابن زبیرؓ نے حق کی حمایت میں یزید کے خلاف حریت اور آزادی کا علم بلند کیا ہوا تھا۔ آخر ایک عقل مند شخص اس بات پر غور کر سکتا ہے کہ کس لیے اس کے خلاف بغاوت برپا ہو رہی تھی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے خلاف کیوں نہ کسی نے سر اُٹھایا۔ اول الذکر کا تو یہ حال تھا کہ جب انہوں نے خالد ابن ولیدؓ جیسے نامور سپہ سالار کو معزول کر دیا اور وہ شام سے مدینہ کی طرف واپس آئے تو راستہ میں آپ (خالدؓ) نے ایک جگہ ایک مجمع کو مخاطب ہو کر کہا، ''حضرت عمرؓ نے مجھ پر سختی کی اور ناحق مجھ کو معزول کر دیا۔'' اس پر ایک شخص نے بڑھ کر کہا، ''اے خالدؓ! خاموش رہ، ایسا نہ ہو کہ آپ کے الفاظ سے بغاوت کی صورت پیدا ہو۔'' حضرت خالدؓ نے فرمایا، ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضرت عمرؓ کے ہوتے ہوئے بغاوت ہو سکتی ہے؟'' غور کیجیے، ایک نہایت ہی ہر دلعزیز سپہ سالار برطرف کیا جاتا ہے جس کے ایک اشارے سے اس پر جان و مال قربان کرنے کے لیے فوجیں تیار ہیں، لیکن وہ خود اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہوتے ہوئے کوئی بغاوت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ دنیا جانتی تھی کہ امیر المومنین میں وہ سب صفات پائی جاتی ہیں جو کہ ایک خلیفہ کے لیے ضروری ہیں اور جو ان کو ہر ایک فرد بشر کا محبوب بنا رہی تھیں۔ برخلاف اس کے یزید سے لوگ بدظن تھے، اس کے کارناموں کو نہایت ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اس کے ذاتی افعال سے متنفر تھے اس لیے ہر ایک طرف سے اس کے خلاف چیخ و پکار ہو رہی تھی۔

ابھی مدینہ منورہ میں اس کے جرنیل مسلم ابن قتیبہ نے یزید کے نام سے سفّاکانہ کارروائی ختم کی ہی تھی کہ مکہ معظمہ کی طرف اس کو کوچ کرنا پڑا۔ کہتے ہیں، وہ بیمار تھا اور جب اُسے زیست کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے حصین ابن نمیر کو وصیت کی کہ وہ اس کے بعد فوج کی سپہ سالاری کرے۔ اس کی وصیت کے ایک ایک لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یزید کے حکم کو خدائی حکم جانتے تھے، اور اسکے احکام کے مقابلہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کو ہیچ خیال کرتے تھے۔ وہ اس قدر حرص کے بندے اور دنیاوی عزت کے خواہاں تھے کہ آخرت کو انہوں نے محض ایک کھیل سمجھ رکھا تھا اور ان کا ایمان تھا کہ یزید کی اطاعت ان کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ مسلم نے حصین ابن نمیر سے کہا، ''مجھے یزید نے آتی دفعہ کہا تھا کہ اپنے بعد حصین ابن نمیر کو سپہ سالار افواج

بنانا۔اب چونکہ میں مرتا ہوں، میں تمہیں خلیفہ بناتا ہوں اور اس فوج کو مکہ لے جا کر ابن زبیرؓ کے ساتھ جنگ کرو اور اگر وہ قلعہ بند ہو جائے تو اس کا محاصرہ کرنا اور منجنیق وغیرہ سے اس پر حملہ کرنا کہ وہ باہر آنے پر مجبور ہو جائے، اور اگر باہر نہ آئے تو مکہ معظمہ کو ویران کر دینا اور مکہ کے لوگوں کو تہ تیغ کر دینا۔یہ خیال رکھنا کہ ایسا نہ کہنا کہ یہ خانۂ خدا ہے اور میں اس کو ویران کر رہا ہوں کیونکہ امام خانۂ خدا اور تمام دنیا سے بزرگ ہوتا ہے۔میں اتنے سال زندہ رہا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے صلہ میں بخشش کی اتنی امید نہیں رکھتا جتنی کہ مدینہ کی اس لڑائی سے اور امام کے حکم سے قتل وغارت کرنے سے رکھتا ہوں۔'' طبریؒ لکھتا ہے کہ اس نے یہ الفاظ نادانی کے سبب سے کہے تھے۔جب اس کی موت کے بعد حصین ابن نمیر فوج کے ہمراہ مکہ معظمہ پہنچا تو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے مقابلہ کیا لیکن ہزیمت اٹھا کر قلعہ بند ہو گئے۔شامی فوج نے مکہ معظمہ کا محاصرہ کر لیا اور منجیقوں سے پتھر برسانے شروع کر دیئے۔انہوں نے منجیقوں کو اس طرح رکھا کہ ان میں سے ایک بیت الحرام پر پتھر برساتی اور دوسری صفا و مروہ پر، اور جو شخص منجیق چلا رہا تھا وہ حبشہ کے کافروں میں سے ایک سپاہی تھا۔اس محاصرہ کو مدت گزر گئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔آخر کار محاصرین نے مجبور ہو کر خانہ کعبہ کو آگ سے جلانے کی تیاری کی اور منجیقوں کے ذریعہ آگ برسانی شروع کی۔کعبہ کے غلاف کو آگ لگ گئی اور وہ سارے کا سارا آن کی آن میں جل کر خاک سیاہ ہو گیا، اور خانہ کعبہ کی دیوار بھی سیاہ ہو گئی۔لیکن خدا کی قدرت دیکھئے، اس خدا کی قدرت جس نے اصحابِ فیل کو حقیر جانوروں کے ہاتھ سے تباہ و برباد کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا اور خانہ کعبہ پر ایک قوی دست حملہ آور کو ایسے ناک چنے چبوائے کہ ان کی ہستی گردابِ فنا میں غرق ہو گئی۔شامیوں کی منجیقیں خانۂ خدا کی بربادی میں مصروف تھیں کہ ایک دن خود بخود ایک منجیق کو آگ لگ گئی جس سے لشکر میں چیخ پکار شروع ہو گئی کہ یہ آگ خدا کی طرف سے ہے کیونکہ ہم نے خانۂ خدا کو جلا دیا ہے۔اس پر فوج والے بد ظن ہو گئے اور انہوں نے کہنا شروع کیا کہ ہم واپس جانا چاہتے ہیں، ہم سے بہت قصور ہوا ہے، ہم ایک پل بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتے۔حصین نے کہا ''میں یزید کو خط لکھتا ہوں، تم لوگ انتظار کرو تا کہ اس کی طرف سے جواب آ جائے، لیکن یزید مر چکا تھا۔

اب وہ لوگ جو یزید کو خصوصاً اور بنی امیّہ کو عموماً حامیانِ دین متین کہتے ہیں غور کریں کہ اس کے اس قسم کے افعال کسی حد تک قابلِ تعریف ہیں۔خانۂ خدا کو جلا رہے ہیں اور ان کے دل میں ذرا سا بھی خوف نہیں آتا۔آنحضرتؐ اور ان کے خلفائے راشدین نے اس سرزمین کو کفر و شرک سے پاک کیا لیکن وہ کافروں کی مدد سے

اس کعبۃ اللہ کو تباہ کرتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان خلفاء میں کونسی ایسی صفات پائی جاتی تھیں جن کے سبب ان کی شان و شوکت کے گیت گائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی تباہی کے کیا کیا سامان نہ کیے، اور اس پاک مذہب کی روایات کو جس نے دنیا میں امن قائم کیا اور لوگوں کو غلامی سے نکال کر شرافت کے اعلیٰ معراج پر پہنچا دیا، ان لوگوں نے آن کی آن میں اپنی سفّاکیوں، سیہ کاریوں اور ستم زایوں سے ملیا میٹ کر دیا۔ اس خائنخدا کو جس کی عزّت و توقیر خود اللہ جل شانہ کو منظور تھی انہوں نے کس بیدردی سے پتھروں اور آتشوں سے تباہ کر دیا۔ کیا خلافت کا یہی مقصد تھا کہ اُسے اپنے گھر کے برباد کرنے میں کام میں لایا جائے اور مسلمانوں کا خون ناحق بہایا جائے۔

تقدیر کی بات بمصداق "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ"، جس سلطنت کو معاویہ نے ہزاروں خون بہا کر اپنے خاندان میں قائم کرنے کی کوشش کی تھی یزید کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ خاندان معاویہ میں ہو گیا۔ یزید کے بعد اس کا لڑکا معاویہ ابن یزید بادشاہ بنایا گیا لیکن اس کی طبعیت کچھ اور طرح کی واقع ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دادا اور باپ کے کارناموں پر حقارت کا اظہار کر کے اس خلافت کو جسے انہوں نے مکر و فریب اور دھوکے کے ساتھ حاصل کیا تھا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور ایسا حجرہ نشین ہوا کہ پھر مر کر ہی نکلا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ اب یہ معاملہ درپیش ہے تو بنی امیّہ کو یہ واقعہ نہایت ہی شاق گزار۔ انہوں نے کوشش کی کہ کسی طرح سلطنت بنی امیّہ میں ہی رہے، چنانچہ وہ بہت سی ردود قدح کے بعد اس فیصلہ پر پہنچے کہ مروان ابن الحکم کو دمشق میں سریر آرائے خلافت کیا جائے۔ مروان ابن الحکم سے آپ کے تعارف کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں یہ وہی مردود ازلی ہے جس نے سب سے پہلے اسلام میں تفرقہ ڈالا، اور اپنے مکر و فریب سے اسلام کا شیرازہ ایسا بکھیرا کہ اب تک اس کے جمع ہونے کی صورت ہی نہیں بندھتی۔ اس کی عمر کے اس وقت آخری ایّام تھے لیکن سلطنت کی ہوس کُوٹ کُوٹ کر اس کے اندر بھری ہوئی تھی۔ اس کی خلافت کے واقعات کے ذکر کی یہاں کچھ ضرورت نہیں۔ صرف اسی قدر کافی ہے کہ مسلمان اس کی حرام زدگیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ تھوڑی مدّت ہی سلطنت کرنے پایا تھا کہ ایک عورت نے جس سے اس نے شادی کر لی تھی رات کے وقت اس کا گلا گھونٹ دیا۔

مروان کے مرنے کے بعد ہم اس کے لڑکے عبدالملک کو تختِ خلافت پر دیکھتے ہیں۔ یہ وہی عالم و فاضل تھا جس نے یزید کی فوج کو مدینہ منورہ کے کل راز بتلا کر خواب گاہِ نبویؐ کی بربادی کروائی تھی۔ اس کے کارناموں

میں بھی ایک ایسا فعل داخل ہے جو کہ قیامت تک اس کے نام کے ساتھ چلتا رہے گا۔اس نے اپنا مشیر و کارندہ اس شخص کو مقرر کیا جس کے ظلم و ستم سے اُس زمانہ میں خلقِ خدا نالاں تھی اور اب تک اس کے سیہ اعمالوں کو یاد کر کے تھرّاتی ہے۔اس کے نام سے بچّہ بچّہ واقف ہے۔وہ حجاج ابن یوسف تھا جو کہ عبدالملک کے عہد میں مدینہ منورہ کا والی تھا اور اپنی سفّاکیوں کی وجہ سے تاریخ اسلام کے صفحات کو سیاہ کیے ہوئے ہے۔امیر المومنین عبدالملک ابن مروان نے تختِ شاہی پر متمکن ہونے کے بعد حجاج ابن یوسف کو حکم دیا کہ فوراً خانہ کعبہ کا محاصرہ کرو۔ چنانچہ ارشاد ہوتے ہی اس نے حرم محترم کا محاصرہ کر کے اس پر سنگباری اور تیر باری شروع کر دی۔اس وقت موسم حج تھا اور حجاج اطراف وجوانب سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہوئے تھے، لیکن ان ظلم پیشہ لوگوں نے اسلام کو ایک کھیل سمجھ رکھا تھا۔ وہی کعبۃ اللہ جس کی حرمت میں قرآن مجید کے صفحات بھرے پڑے ہیں، ان لوگوں کے ہاتھوں سے تباہ ہو رہا تھا جو کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خادمِ حرمین شریفین کہلاتے تھے۔ یہ وہی کعبہ تھا جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ اگر کوئی جرم کر کے اس کے اندر پناہ لے تو اسے وہاں گرفتار کرنا حرام ہے اور جب تک اس کے اندر رہے کوئی بھی اس کا مزاہم نہیں ہو سکتا۔ آہ! آج وہی کعبہ بربادی کے کنارہ تک پہنچ رہا ہے۔کیا عبدالملک اور اس قسم کے دیگر لوگوں کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ ہم اپنے افعال سے کیا کر رہے ہیں، اور آیندہ کے لیے کس قسم کی یادگار چھوڑ رہے ہیں۔ مانا کہ وہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے خلاف برسرپیکار تھا جنہوں نے حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہوا تھا، لیکن ان کے لیے ضروری تھا کہ ان کی بغاوت کے اسباب معلوم کرتے اور لوگوں کی بدگمانیوں کو رفع کرنے کے ذرائع پیدا کرتے۔

محاصرہ کچھ زیادہ عرصہ تک نہ رہا اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ گرفتار ہو کر دار پر چڑھائے گئے۔ حجاج نے خانہ کعبہ کو گرادیا اور اس پر نئی عمارت بنوائی جو کہ اب تک موجود ہے۔

عبدالملک کے بعد اس کا فرزند ولید تخت نشین ہوا۔یہ بالکل جاہل تھا، کچھ لکھا پڑھا نہ تھا، لیکن اکبر کی طرح نہایت ہی عاقل اور منتظم بادشاہ تھا۔اس کے عہد میں سلطنتِ اسلامی دُور دُور تک پھیل گئی اور مسلمانوں نے افغانستان فتح کر کے سندھ تک مار کی۔ اسے اگرچہ رعایا کا بہت خیال رہا کرتا تھا اور ان کے آرام و آسایش کے ذرائع بہم پہنچانے میں دریغ نہ کرتا لیکن اپنے بزرگوں کی روایات زندہ رکھتا تھا۔ بنی امیّہ میں اگرچہ چند ایک خلفاء ایسے ہوئے ہیں جو کہ دل میں اسلام کا درد رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا زمانہ نہایت ہی پُر امن ہو

لیکن مجبور تھے کیونکہ ان کی گھٹی میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کا اثر اس درجہ داخل تھا کہ انہیں ان کی سفّاکانہ یادگار قائم رکھنی ہی پڑتی تھی۔یہی ولید ابن عبدالملک جس قدر انتظامِ سلطنت کے لحاظ سے شہرۂ آفاق ہوا ہے اسی قدر ظلم و جبر میں طغرائے امتیاز سے مزیّن ہے۔اس کے ظالمانہ افعال سے لوگ کانپتے تھے۔اس نے بھی اپنے اسلاف کی طرح بڑے بڑے لوگوں کو چُن چُن کر مروایا اور خاندانِ نبوت پر بڑے بڑے جور و ستم کیے۔اس کے حکم سے سعید ابن جبیرؓ صحابی شہید کیے گئے اور ایک روایت ہے کہ اس نے حضرت امام زین العابدینؑ کو اپنے پاس بُلا کر قید کیا اور پھر انہیں زہر دلوا کر شہید کروایا۔افسوس آتا ہے کہ ان لوگوں کو خدا کا خوف نہیں تھا۔ جس وقت وہ اہلبیت پر ظلم کرتے تھے تو کیا انہیں خیال نہیں آتا تھا کہ قیامت کے روز سرورِ کائناتؐ کو منہ دکھلانا ہے۔ان واقعات کے بیان کرنے سے مطلب صرف یہی ہے کہ ناظرین دیکھ لیں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں (خصوصاً بنی امیّہ کے) خلافت کی کیا درگت ہوئی۔ خلافت تو اس لیے قائم کی گئی تھی کہ نظامِ عالم کے بگڑے ہوئے شیرازے کو درست کیا جائے اور اس ظلم و تاریکی کو دُور کیا جائے۔ جو کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر دنیا میں رونما تھی۔ لیکن ان کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہی بات اُلٹ ہو گئی اور آپ کے جانشینوں کے ہاتھ سے لوگوں پر ایسے ایسے ظلم ہوئے جن کے بیان سے کلیجہ کانپتا ہے۔

اس وقت لوگ چیخ پکار کر رہے ہیں کہ اسلام تباہ ہو رہا ہے، مسلمان ہر جگہ بربادی کا سامنا کر رہے ہیں غیر اقوام مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے محو کرنے پر تُلی ہوئی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کی خلافت دنیا سے اُٹھ جائے۔ لیکن کیا انہوں نے کبھی سوچا بھی ہے کہ یہ مصائب ان پر کس طرح وارد ہو رہے ہیں۔لامحالہ اسلام میں بڑے بڑے جیّد شہنشاہ ہوئے ہیں، ان کی سلطنتیں نہایت ہی شان و شوکت کی گزری ہیں، لیکن یہ کبھی بھی نہیں دیکھا گیا کہ ان کا طرزِ عمل اسلام کی روایات کے مطابق تھا۔انہوں نے خلافت کو امارت میں اور آزادی کو غلامی میں تبدیل کر دیا جس کے سبب آج مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

آگے چل کر ہم یزید ابن عبدالملک کو والیٔ خلافت دیکھتے ہیں۔یہ جناب بھی اپنے وقت میں فرد تھے جیسا کہ ان کا نام بنی امیّہ کے دوسرے بادشاہ یزید (علیہ العنۃ) کے ساتھ ملتا ہے۔اسی طرح خونریزی، عیّاشی، شراب خوری، بدمزاجی اور خود پسندی میں بھی اس جیسے تھے۔اس نے بھی دنیا کی کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں ہے جو چھوڑی ہو۔اس کی حکومت کا زمانہ چار سال تک رہا لیکن اس قلیل عرصہ میں اس نے مسلمانوں کے قتل اور عورتوں کے عشق میں دل کھول کھول کر حصّہ لیا۔

اس کے بعد ہشام ابن الملک تختِ خلافت پر بیٹھا۔ بڑا بد مزاج اور جابر بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں عیش و عشرت کی کوئی حد نہ رہی۔

پھر ولید ابن یزید ابن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ مؤرخین کہتے ہیں وہ بنی امیّہ کی ناک تھا۔ کوئی گناہ نہیں جو اس سے سرزد نہیں ہوا۔ ہر وقت شراب کے نشہ میں چُور اور زنا میں مشغول رہتا تھا۔ شاعر بھی تھا اور مغنّی بھی تھا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ حج کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں خوب دل کھول کر شراب پیتا اور رنگ رلیاں مناتا۔ انصاف کی نظر سے دیکھئے خلیفۃ المسلمین ہے، امیر المومنین ہے، حج کے لیے جارہا ہے، اور بجائے احرام کے شراب کی چادر اپنے جسم پر اوڑھ رہا ہے۔ کیا اسی بل پر یہ لوگ اس پاک گدّی کے وارث کہلانے کے مستحق ہیں جو کہ سرور کائناتؐ نے چھوڑی اور جس کو خلفائے راشدین نے اپنی ان تھک کوششوں سے زیب و زینت دی۔

اس خاندان کے تیرہ کے قریب بادشاہ ہوئے لیکن ظلم و ستم اور عیش و عشرت میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ دنیا کا کوئی گناہ نہیں جو ان سے سرزد نہ ہوا ہو۔ انہوں نے مسلمانوں کے خونِ ناحق سے خوب اپنے ہاتھ رنگے۔ انہوں نے اہلبیت کو چُن چُن کر تہ تیغ کیا، مدینہ منورہ کو برباد کیا، خانہ کعبہ کو تباہ کیا، بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کو موت کے گھاٹ اُتارا، شہروں کو ویران کیا، زنا میں بڑے بڑے جوہر دکھلائے، شراب نوشی میں دنیا کو مات کیا۔ غرضیکہ کیا کیا باتیں ہیں جن میں انہوں نے اپنا کمال نہیں دکھلایا اور پھر اس پر مسلمان کہتے ہیں کہ اُن کے اسلام پر بڑے بڑے احسان ہیں۔

ہم بار بار لکھ آئے ہیں کہ جب تک مسلمان ضد اور ہٹ نہیں چھوڑیں گے ان کی ترقی کی صُورت ہر گز ہر گز نہیں نکلے گی۔ اُنہیں چاہیے کہ انصاف سے کام لیں اور ان لوگوں کی بے جا طرف داری کر کے اسلام میں تفرقہ پردازی کو زیادہ ترقی نہ دیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حقیقتِ حال سے انہیں آگاہ کرنا چاہتا ہے تو لوگ اُسے الزام دیتے ہیں کہ کسی خاص گروہ کو خوش کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ اور حیرانی یہ ہے کہ بڑے بڑے مؤرخین بھی اس غلطی میں الجھے ہوئے ہیں۔ شاہانِ بنی امیّہ سادات کا خون گراتے تھے، اہل بیت کی بے عزّتی کرتے تھے، ناحق ان پر ظلم کرتے تھے، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ تدبیر مملکت ان امورات کی مقتضی تھی۔ اچھی تدبیر تھی، خاندانِ نبوّت کو تباہ کیا جائے، صحابہ کرامؓ کو فریاد کیا جائے۔ جنہوں نے آنحضرتؐ کی پاک صحبت کا حظ اٹھایا تھا ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہے تھے، اور مروان، عبدالملک، ولید اور یزید

جیسے لوگوں کی نسبت خلافت کے اصول اچھی طرح جانتے تھے، اور پھر یہ تدبیر تھی۔ اگر اسلام اس قسم کی تدبیر کا حکم دیتا ہے تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

یہ سچ ہے کہ دنیا بھلے آدمیوں سے خالی نہیں ہے۔ وہی لوگ جو بنی امیّہ کے افعال قبیحہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کس لیے سلیمان ابن عبد الملک اور عمر و ابن عبدالعزیز جیسے خلفاء کی جو کہ بنی امیّہ میں سے تھے عزّت اور توقیر کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کے نیک سلوک اور دینداری نے مسلمانوں کو خوش کیا اور وہ اپنے دیندارانہ اور عدل و انصاف کے کاموں سے بہت ہی عمدہ مثال اس دنیا میں چھوڑ گئے۔ باوجود ایک ایسے خاندان میں سے ہونے کے جو کہ اہلبیت کا دشمن اور اسلام کے تباہ کرنے والا تھا ان کا وجود اسلام کے لیے منقنمات میں سے ہے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو نفرت سے دیکھا اور ان کے کارناموں اور طرز عمل پر بیزاری کا اظہار کیا۔ انہوں نے ان کے اصولوں کو تبدیل کر دیا اور ان کی قائم کردہ نظیروں کو مسترد کر دیا۔

اکثر مؤرخین حضرت عمر و ابن عبدالعزیزؒ کو خلفائے راشدین میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کا عہد حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کا عدل اور ان کی سادہ زندگی کی یاد دلوں میں تازہ کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خلافت کی باگ ہاتھ میں لینے سے پہلے وہ تکلّفات کے حد درجہ دلدادہ تھے اور ہر وقت عیش و عشرت میں مشغول رہتے تھے، لیکن خلیفہ ہوتے ہی انہوں نے اپنی اہم ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور خلق خدا کی بہتری میں مصروف ہو گئے۔ وہ کچھ بھی بیت المال سے نہیں لیا کرتے تھے اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

مسلمانوں میں فدک کے بارے میں اس وقت تک بڑے بڑے جھگڑے ہو رہے ہیں لیکن حضرت عمر و ابن عبدالعزیزؒ نے اس مسئلہ کو کس خوبی کے ساتھ سلجھایا۔ اگر اسلام کے دونوں بڑے گروہ (شیعہ و سنی) ان کے فیصلہ پر غور کریں تو ہمارے خیال میں ایک چھوٹی سی غیر ضروری بات جسے اس قدر زیادہ طول دیا گیا ہے کبھی بھی آیندہ کے لیے متنازعہ فیہ مسئلہ نہ رہے۔ اس کی نسبت آپ نے فرمایا "آنحضرتؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرا نے باغِ فدک اپنے والد بزرگوار سے مانگا لیکن انہوں نے نہ دیا، اور مسلمانوں کے لیے وقف کر کے اس کی آمدنی کو کار خیر میں خرچ کیا۔ آپ کے بعد بھی خلفائے راشدین نے یہی کیا۔ لیکن جب حکومت ہمارے خاندان میں آئی تو ہمارے بزرگوں نے اسے اپنی وارثت تسلیم کر کے اپنے درمیان تقسیم کر لیا اور وہ میرے، ولید اور سلیمان کے درمیان بٹ گیا اور اب کامل طور سے وہ میری ملکیّت ہو گیا۔ لیکن آج میں کہتا ہوں کہ یہ فعل سراسر ناجائز اور بے انصافی پر مبنی تھا۔ میں اسے واپس کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جو حالت اس کی سرور

کائناتؐ کے وقت تھی اسی کے موافق اس کی آمدنی خرچ کی جائے۔''

ہم حضرت عمر وابن عبدالعزیزؒ کی زندگی کے حالات کا نہایت ہی مختصر اقتباس اس غرض سے درج کتاب کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو بے جا طور سے بنی امیّہ کی طرف داری کا دم بھرتے ہیں معلوم کریں کہ خود ان کے خاندان کا ہی جلیل القدر خلیفہ ان کے طرز عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے کارناموں کو حقیر جانتا ہے۔ اس نے فعلاً اور قولاً اس امر کا اظہار کر دیا کہ خاندان بنی امیّہ نے جو کچھ روش عامۃ المسلمین کے متعلق اور خاندان نبوت کے متعلق رکھی تھی بالکل قابل اعتراض تھی، اور اسی لیے انہوں نے اپنے امکان بھر کوشش کی کہ خلفائے راشدین کا نمونہ پیش کیا جائے جنہوں نے عدل وانصاف اور راست بازی کے ساتھ حکومت کی اور جن سے بہتر طرز حکومت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ آخر وہ بھی تو انہیں لوگوں میں سے تھے، اسی خاندان کے رکن تھے، انہوں نے کیوں ان سے بیزاری ظاہر کی۔ صرف اس لیے کہ خدائے عزوجل نے انہیں دل کا درد عطا کیا ہوا تھا اور ان کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ خلافت ایک نہایت ہی نازک منصب ہے جسے نباہنا نہایت ہی مشکل ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اکثر خلوت میں بے قرار ہو کر رویا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ دیکھیے، میرا کیا انجام ہوتا ہے۔

ہم نے شروع میں بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ عہد شاہزادگی میں شان وشوکت کے نہایت ہی دلدادہ تھے اور پُر تکلف لباس زیب بدن کرنے کے عادی تھے۔ اسی خیال سے جس دن تخت نشین ہوئے غلام شاندار سواری لے کر حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھتے ہی فرمایا'' لے جاؤ مجھے ان متکبّرانہ سواریوں کی ضرورت نہیں ہے'' اور اپنے دُبلے پتلے خچّر پر سوار ہو کر گھر چلے گئے۔ اللہ اللہ! کیا شان ہے اور کیسی نیک نیتی ہے۔ جب ہم ان کے واقعات پڑھتے ہیں تو فاروق اعظمؓ کا عہد یاد آجاتا ہے اور ہو بہو ان کی زندگی کا پاک مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ حضرت عمر وابن عبدالعزیزؒ کے اس طرزِ عمل نے ہمیں خلیفہ ثانی کے اس قسم کے ایک واقعہ کی یاد دلائی ہے جس کا تذکرہ اس جگہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

جب فاروق اعظمؓ کی فوجیں بیت المقدس کی فتح کے لیے گئی ہوئی تھیں اور کبھی کبھی محصورین کے ساتھ جھڑپ ہو جائے کرتی تھی تو اس شہر کے یہود علماء نے سپہ سالار افواج اسلامیہ سے کہا کہ جو شخص ہمارے شہر کو فتح کرے گا اس کا حلیہ ہماری کتب میں دیا ہوا ہے۔ جب تک وہ خود نہیں آئے گا اس کا فتح ہونا مشکل ہے۔ اس پر حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں تحریر کیا کہ آپ تشریف لائیں، اس لیے کہ بیت

المقدس آپ کے سوا فتح نہیں ہونے کا۔ آپؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کر کے بیت المقدس کے سفر کا عزم کیا اور اپنی سواری کے لیے صرف ایک اونٹ اپنے ہمراہ لیا جس پر باری باری آپؓ خود اور آپ کا غلام سوار ہوتا تھا۔ جب آپ بیت المقدس کے قریب پہنچے تو امیر الجیش حضرت ابو عبیدہ نے آپ کا استقبال کیا۔ نماز ظہر کے بعد آپ لشکرِ اسلام کا معائنہ کرتے ہوئے شہر پناہ کے قریب تک تشریف لے گئے۔ آپ اس وقت اُونٹ پر سوار تھے اور سُوتی کپڑے کی ایک گدڑی پہنے ہوئے تھے جس میں چودہ پیوند تھے اور بعض پیوند کپڑا نہ ملنے کے باعث چمڑے کے تھے۔ مسلمانوں نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین اس وقت تو بہتر ہوتا کہ حضور ایک گھوڑے پر سوار ہو لیتے اور ان کپڑوں کو اتار کر کوئی اچھا جوڑا پہن لیتے تاکہ دشمنوں کے دلوں پر کچھ تو رعب پڑے۔'' آپ اس رائے کو مانتے نہ تھے مگر مسلمانوں نے بے حد اصرار کیا اور انتہا سے زیادہ خوشامد درآمد کی، تو آپ راضی ہو گئے۔ وہ گدڑی اتار کر مصر کا ایک پُر تکلّف جوڑا پہن لیا۔ کندھے پر ایک رُومال ڈال لیا جو ابو عبیدہؓ نے لا کر پیش کیا تھا اور اچھے رومی گھوڑے پر سوار ہوئے۔ آپ کے سوار ہوتے ہی گھوڑا اکڑنے لگا۔ آپ دو چار قدم جا کر رُک گئے اور فرمایا، ''میری لغزش معاف کرو، خدا تمہاری لغزشیں روز جزا کو معاف کرے۔ قریب تھا کہ تمہارا امیر اس غرور اور کبر سے ہلاک ہو جائے جو اتنی ہی دیر میں اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔'' یہ کہتے ہی آپ نے وہ اُجلے کپڑے اتار کر پھینک دیے، اپنی وہی گدڑی پہن لی، اور اپنے اس اونٹ پر سوار ہو گئے۔

حضرت عمر وابن عبد العزیزؒ کا ایک غلام تھا جو کہ ہر روز جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لایا کرتا تھا۔ ایک دن آپ نے اس سے پوچھا کہ میری نسبت لوگوں کا کیا خیال ہے۔ اس نے کہا، خیال تو سب کا اچھا ہے لیکن ہم تم دونوں کا بہت ہی بُرا حال ہے۔ آپ نے حیران ہو کر اس سے دریافت کیا، یہ کس طرح۔ اس نے کہا، جب آپ خلیفہ نہیں ہوئے تھے، ہماری نہایت آرام سے گزرتی تھی، اور جس وقت آپ خلیفہ بنے، امید تھی کہ پہلے سے زیادہ راحت ملے گی لیکن اس کے برعکس ہوا۔ اب تو پہلے سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا، جا تو آزاد ہے۔ خدا اس کے طفیل مجھ کو بھی حکومت کے عذاب سے نجات اور آزادی دے۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی امیّہ جیسے خاندان میں حضرت عمر وابن عبد العزیزؒ کے ایسے نیک طینت انسان کا پیدا ہونا حیرانی کی بات ہے۔ ان کے عادات اور اطوار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس خاندان کے ہر ایک فعل سے بیزار تھے۔ آپ نے معلوم کر ہی لیا ہو گا کہ بنی امیّہ والوں نے کس طرح خاندان نبوت کے لوگوں کو چُن چُن کر قتل کیا اور ان پر وہ وہ ظلم کیے جن کے دوہرانے کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ حضرت عمر وابن عبد العزیزؒ نے اس کو

محسوس کیااوران کے اس فعل پر عملی صورت میں اظہارِ نفرت کیا،اور دکھلایا کہ ان کی نگاہ میں خاندان نبوت کی کس قدر وقعت ہے، اگرچہ اس میں انہوں نے اپنی جان تک گنوائی۔ آپ نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے بعد بنی فاطمہ کے کسی رکن کو تاج وتخت کا وارث کریں لیکن جب بنی امیّہ نے آپ کے اس ارادہ سے آگاہی حاصل کی توانہوں نے آپ کے قت کی سازش کی اور ایک غلام کو رشوت دے کر آپ کو زہر دلوادی جس سے بیمار ہو کر آپ انتقال کر گئے۔

آپ کی زندگی کے بہت سے واقعات ہیں جن سے آپ کے عدل، سادہ مزاجی اور دینداری کا ثبوت ملتا ہے لیکن یہاں طوالت کے خوف سے ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا ہے۔ تاہم جس قدر بھی بیان کیا گیا ہے اس سے ناظرین نے معلوم کر لیا ہو گا کہ خلیفہ کس قسم کا ہونا چاہیے اور دیگر خلفائے بنی امیّہ کس حد تک خلافت کے اہل تھے۔ وہ اپنے خاندان والوں سے اس قدر رنجیدہ خاطر رہا کرتے تھے کہ ایک دن آپ نے اُن سے خطاب کر کے فرمایا''خلقت کا حق ان کو واپس دے دو جو تمہارے بزرگوں نے غصب کر لیا تھا۔''سب خاموش بیٹھے رہے لیکن ایک شخص بولا۔''ہم ہر گز نہ دیں گے کیونکہ اگر ایسا کریں گے تو گویا اپنے باپ دادا کو غاصب اور گنہگار ٹھہرائیں گے اور اپنے بچّوں کو مفلس کر دیں گے''۔اس پر آپ نے فرمایا،''کیا کروں، فتنہ وفساد کا ڈر ہے ورنہ تمہارے رخساروں پر طمانچے مار کر یہ حق واپس کراتا۔''

ناظرین اس مقدس انسان کے کارناموں کو بنی امیّہ کے دیگر خلفاء کے کارناموں سے مقابلہ کر کے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی خلافت سے اسلام کا کیا حشر ہوا۔

# گیارہویں فصل

## بنی عباس کی ریشہ دوانیاں

### حُصُولِ خلافت

اصل میں بات یہ ہے کہ جب سے امیر معاویہ نے حضرت علیؓ کی نقصِ خلافت کی کوششوں میں سر گرمی سے حصّہ لے کر اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خلافت کو مخصوص کرنا چاہا تب ہی سے اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلفاء کے عہدوں میں مسلمانوں میں کسی قسم کا تفرقہ واقع نہیں ہوا تھا اس لیے کہ انہوں نے نہایت ہی عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی تھی۔ اور اگر ان کے زمانۂ خلافت کے آغاز میں سرزمینِ عرب میں ایسے لوگ تھے بھی جو ان کی نسبت حضرت علیؓ کو ترجیح دیتے تھے تو ان کی خدمتِ اسلام، دینداری، پاک بازی، عدل و انصاف اور نیکی نے لوگوں کو گرویدۂ احسان کر کے ان کے ساتھ ایسا وابستہ کر دیا کہ وہ مخالفت کے تمام خیالات فراموش کر کے دل و جان سے ان کے خیر خواہ ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ کی وسیع مملکت میں ایک واحد ہستی بھی ایسی نہ رہی جو کہ آپ کے خلاف نظر آتی ہو۔ خود حضرت علیؓ کے الفاظ یاد کیجیے جو کہ اس وقت انہوں نے اپنی زبان مبارک سے نکالے تھے جبکہ معاویہ کا وفد جنگ صفین سے پہلے آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپؓ نے فرمایا تھا، ''آنحضرتؐ نے اپنی موت کے وقت کسی کو خلیفہ نامزد نہ کیا لیکن لوگوں نے متفقہ طور سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ پھر جب ابو بکر صدیقؓ نے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی تو میں نے بھی اُن سے بیعت کر لی۔'' ان الفاظ سے یہی پتا چلتا ہے کہ آپ خلافت کے سب سے پہلے دعویدار تھے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ شیخین نہایت ہی عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں تو آپؓ نے بیعت کر لی اور ہر وقت ان کے ہاتھ بٹانے میں مستعد رہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ آپ کے عہد میں معاویہ نے مخالفت کر کے اُمتِ مرحومہ کے درمیان ایسا نفاق کا بیج بویا کہ اس وقت تک اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔

اگر معاویہ خلیفہ ہونے کے بعد بھی اپنی طرزِ حکومت شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) کے طریقۂ حکومت کے مطابق

رکھتے تو ممکن تھا کہ آہستہ آہستہ لوگ آپ کے غصبِ خلافت کی بات فراموش کر دیتے اور ان کا وہ رنج جو آپ نے حضرت علیؓ کے خلاف بے جا جنگ و جدل کر کے دنیائے اسلام میں نفاق کی صورت میں پیدا کر دیا تھا زمانہ کے گزرنے کے ساتھ محو ہو جاتا، اور لوگ آپ کا اور آپ کے جانشینوں کا انصاف دیکھ کر بنی اُمیّہ کی طرف راغب ہو جاتے۔ مگر آپ نے غضب ہی کیا اور چہ جائیکہ حکومت کے حاصل ہونے کے بعد اموراتِ خلافت میں ان قوانین اور اصولوں کو برتتے جو کہ اسلام کی روایات کے ساتھ مطابقت رکھنے رکھنے والے تھے، آپ نے اپنے منگھڑت اصول جاری کر دیئے اور ایسی ایسی بدعات پیدا کیں جن سے لوگوں کے کان ناآشنا تھے۔ اور سب سے بُری بات یہ کی کہ خاندانِ نبوّت کی طرف سے اپنے دل میں کینہ، بغض اور عناد رکھتے رہے اور یہی کوشش کرتے رہے کہ اہلبیت کو تیرِ ستم کا نشانہ بنایا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے حضرت حسنؑ کو زہر دلوایا، اور دیگر اکابرینِ اہلبیت کو مروایا، اور ان لوگوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا جو کہ آپ کی خلافت کو دل و جان سے نہیں چاہتے تھے۔

خیر جو کچھ آپ نے کیا وہ تو کیا۔ آپ کے تدبّر نے پھر بھی لوگوں کو ایسے مواقع نہ دیئے کہ علانیہ آپ سے مخالفت کرتے کیونکہ آپ کی سیاست مانی ہوئی تھی جو بات آپ کو ایسی معلوم ہوتی۔ جس میں لوگوں کا میلان آپ کے خلاف نظر آتا تو آپ اس سے در گزر کرتے۔ مگر آپ کے جانشینوں نے تو حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے وہ کچھ کیا جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سب سے پہلے آپ کے فرزند ارجمند نے کربلا کے میدان میں جگر گوشانِ رسول اللہؐ کو ایک ایک کر کے نہایت ہی بے رحمی اور ناخدا ترسی سے ذبح کیا۔ پھر اس کے بعد آپ کے دیگر جانشینوں کے لیے ایک مثال قائم ہو گئی اور انہوں نے خاندان نبوت پر ظلم کرنے کے ساتھ سارے بنی ہاشم کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بنایا۔ ان کا معمول ہو گیا کہ جہاں کہیں بنی ہاشم کے کسی رکن کو پاتے موت کے گھاٹ اتارتے، اور للہ فی اللہ انہیں مدعی خلافت سمجھ کر ان کی نگرانی کرتے، اور اگر موقعہ ملتا تو قتل کر دیتے۔ جب اس قسم کا ظلم و ستم حد سے گزر گیا تو حالت دگرگوں ہو گئی اور بنی ہاشم خصوصاً اور دیگر لوگ عموماً اندر ہی اندر ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ مگر یہ لوگ علانیہ طور سے ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کے استبداد اور جور نے دنیا کو ایسا ڈرایا ہوا تھا کہ جہاں کہیں انہیں معلوم ہوتا کہ فلاں شخص اُن کا دشمن ہے فوراً اُس کو صفحہ ہستی سے ایسا مٹا دیا جاتا کہ پھر اس کا نام و نشان بھی نظر نہ آتا۔

یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی خاندان میں مشترکہ طور سے مصیبت آتی ہے تو سارے کا سارا اکٹھا ہو کر اس کے

جھیلنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیتا ہے۔یہی حالت بنی ہاشم کی تھی۔ چونکہ بنی ہاشم سب کے سب بنی اُمیّہ کے جور و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے اس لیے سارا خاندان آپس میں ہمدردی رکھتا تھا، اور بنی فاطمہ اور بنی عباس ان مصائب کے برداشت کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ اب جبکہ کوئی ظاہری طاقت بنی ہاشم کو بنی امیّہ کے پنجۂ استبداد سے نہ چھڑا سکی تو انہوں نے اس کی یہ تجویز نکالی کہ اپنے معتقدین اور طرف داروں کو داعی اور نقیب کے لقب سے دنیا میں پھیلانا شروع کیا جو کہ ہر جگہ جاتے تھے۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ سلطنت کی اطاعت کرتے اور اپنے طرزِ عمل سے دکھاتے کہ وہ سب سے زیادہ حکومت کے خیر خواہ ہیں، لیکن باطن میں بنی ہاشم کے لیے لوگوں سے بیعت لیتے اور کہتے کہ حقیقتاً اگر خلافت کے وارث کوئی ہیں تو وہ بنی ہاشم ہیں کیونکہ آنحضرتؐ اسی خاندان سے تھے اور اس لیے ضروری ہے کہ آپ کی اولاد آپ کی گدّی کی وارث ہو۔ ان داعیوں اور نقیبوں کا لوگوں پر بہت اچھا اثر ہوا کرتا تھا جس کا سبب یہ ہے کہ بنی اُمیّہ کا مرکز شام تھا۔ جب سے امیر معاویہ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں دمشق اپنا صدر مقام قرار دیا تھا ان کی یہ کوشش رہی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات جما دی جائے کہ ہمارے سوا آنحضرتؐ کا قریبی رشتہ دار کوئی ہے ہی نہیں تاکہ لوگوں کی ہمدردی آپؓ سے اور آپ کے جانشینوں کے ساتھ رہے۔ اور حقیقت میں ہوا بھی ایسا ہی۔ چونکہ شامیوں کا آپ سے ہی واسطہ رہتا تھا اس لیے ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بنی اُمیّہ کے سوا کوئی اور آنحضرتؐ کے قرابت دار نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ بنی امیّہ کے استیصال کے بعد جب ابو العباس سفاح خلیفہ ہوا تو اس نے ایک دن اہل شام سے پوچھا ''تم نے اولادِ پیغمبر کو چھوڑ کر ان بنی امیّہ کی اطاعت کیوں کی تھی؟'' انہوں نے قسمیں کھا کر جواب دیا ''ہم تو یہی سمجھے تھے کہ بنی امیّہ کے سوا دنیا میں اور کوئی شخص پیغمبر کا قرابت دار موجود نہیں ہے۔'' (طبریؒ) اب جبکہ بنی ہاشم کے داعیوں نے اندر ہی اندر لوگوں کو یقین دلایا کہ بنی امیّہ کچھ بھی نہیں، حقیقی قرابت دار بنی ہاشم ہیں تو ان کی طبیعتیں متنفر ہو گئیں اور وقت پر وہ بنی ہاشم کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب آہستہ آہستہ ان نقباء کے ذریعہ سازشوں کا جال بنی اُمیّہ کے خلاف بچھ گیا تو وقت آ گیا کہ علانیہ طور سے بنی امیّہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے۔

غور کیجیے، یہ خلافت کس طرح ایک کھلونا بنی رہی تھی۔ چاروں طرف سے اس پر حملوں کی بھرمار ہو رہی تھی اور ہر ایک اسے قابو کرنے پر مُستعد نظر آ رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد اشاعتِ اسلام تبدیل بہ اشاعتِ بغض و عناد اور کینہ ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں بنی امیّہ کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ اگر وہ پیشتر سے ہی اس میں اعتدال سے کام

لیتے تو یہ نوبت کبھی بھی نہ آتی اور اسلام کو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔

اب بنی ہاشم میں بھی دو گروہ ہو گئے، ایک بنی عباس دوسرے بنی فاطمہ۔ بنی عباس آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد سے تھے اور بنی فاطمہ حسینؓ کی اولاد تھے۔ ان دونوں گروہوں کی خلافت پر قبضہ جمانے کے لیے علیحدہ علیحدہ کوششیں شروع ہو گئیں لیکن بنی عباس تدبیر ملکی میں بنی فاطمہ سے بڑھ کر تھے۔ انہوں نے بنی امیّہ کے خلاف جو ریشہ دوانیاں شروع کیں تو اُن کا سلسلہ باضابطہ طور سے شروع کیا اور اپنے حقوق اس خوبی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیے کہ وہ بہ نسبت بنی فاطمہ کے ان کی طرف جُھک پڑے۔ قسمت نے بھی بنی عباس کا ساتھ دیا اور انہیں ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل ہو گئیں جو کہ نہایت ہی چلتا پرزہ اور کامل طور سے تدبیر ملکی میں طاق تھا۔ اس کا نام ابو مسلم خراسانی تھا اور بنی عباس کا سب سے بڑا داعی تھا۔ اس کے جوش اور سرگرمی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے ایران میں اپنا اس قدر اعتبار جمایا کہ لوگ جوق در جوق اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے اور بنی امیّہ کے خلاف بغاوت کرنے پر کھڑے ہو گئے۔ ابو مسلم سیاہ لباس پہنا کرتا تھا، اور اپنے ساتھ سیاہ جھنڈا اور سیاہ نشان رکھا کرتا تھا، اور نہایت ہی پوشیدہ طور سے خلقت سے بنی عباس کے لیے بیعت لیتا تھا، اور جگہ جگہ عباسیوں کا اقتدار قائم کرتا تھا۔

ظلم واستبداد کو کبھی ہمیشگی نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس حکومت کا دارومدار ظلم پر ہوا ہے وہ آخر کار نیست و نابود ہو گئی۔ یہی حال بنی امیّہ کا تھا۔ ان میں ظلم اور عیش پرستی اس قدر تھی کہ لوگ انہیں نفرت سے دیکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسی طاقت ان کا ساتھ دے جو کہ انہیں بنی امیّہ کے پنجۂ ستم سے رہائی دلوائے۔

اس کے علاوہ ان کے خلفاء کی کمزوریاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ جب سب سے آخیر خلیفہ مروان الحمار تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے آپ کو بیرونی سازشوں کے علاوہ اپنی ہی قوم کے مفسد لوگوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک طرف سلیمان ابن ہشام کی بغاوت تھی، دوسری طرف عبداللہ ابن معاویہ ابن یزید سرکش ہوا ہوا تھا، تیسری طرف ضحاک کا خروج بلائے بے درماں کی طرح نمودار ہو رہا تھا، اور چوتھی طرف یمن کے طالب الحق کی شورش کھڑی ہوئی ہوئی تھی۔ لیکن سب سے خطرناک ابو مسلم خراسانی کا جوش و خروش تھا جس نے بنی امیّہ کے اوسان کھو دیئے تھے۔ اگرچہ مروان کو ان سب مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کی عقل اور مستعدی میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس نے نہایت ہی دلیری اور بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور اپنی حیرت انگیز تدبیر سے خانہ جنگیوں کو سنبھال لیا۔ مگر اس کے اسلاف کی ستم زایوں کا چرکا جو لوگوں کے دلوں پر عموماً اور خاندان بنی ہاشم

کے دلوں پر خصوصاً لگا ہوا تھا وہ کسی صورت مندمل نہیں ہو سکتا تھا، اور بنی اُمیّہ کے خاندان کا اقبال ہمیشہ کے لیے بنی عباس کے آگے ایسا سرنگوں ہوا کہ قیامت تک ان کو سر اٹھانا نصیب نہ ہوا اور اُن کی صد سالہ شاندار سلطنت آن کی آن میں خاک سیاہ ہو گئی۔

اب سُنیے، اس بیچارے آخری خلیفہ مروان الحمار کا کیا حشر ہوا اور خلیفہ ابو العباس سفّاح پہلا عباسی خلیفہ کس شان کے ساتھ خلافت اسلامیہ کا مالک ہوا۔ جب ابو مسلم خراسانی کی کوششوں سے سرزمین ایران میں بنی امیّہ کا کافی طور سے قلع قمع ہو گیا تو بنی ہاشم میں سے کسی کو خلیفہ بنانے کے لیے کوفہ میں لوگوں کا ایک مجمع ہوا اور ابو سلمہ (کوفہ کا ایک بااثر شخص تھا) نے منبر پر کھڑے ہو کر خدائے عزوجل کی حمد اور آنحضرتؐ کی نعت کے بعد اس طرح لوگوں کو مخاطب کیا۔ ''اے مسلمانو! جو کچھ میں کروں کیا تم اس پر متفق ہو؟'' انہوں نے جواب دیا، ''کہو جو کچھ کہ تم چاہتے ہو۔'' ابو سلمہ نے کہا، ''ابو مسلم ابن عبدالرحمٰن نے مجھے ایک خط میں فرمایا ہے کہ خلافت بنی ہاشم میں قائم کی جائے تاکہ خلافت بنی امیّہ اور ان کے بیداد سے رہائی پائے، اس لیے میں نے بنی ہاشم میں جہاں تک غور کیا ہے عبدالرحمٰن ابن محمد ابن عباس سے زیادہ بزرگ کسی کو نہیں پایا ہے۔ وہ سب سے بہتر اور سب سے زیادہ صالح ہے۔ میں خلافت کے لیے اسے پسند کرتا ہوں، تم بھی کرو۔'' اس پر لوگوں نے اس کی تجویز کو پسند کیا اور بلند آواز سے تکبیر کہی۔ چنانچہ ابو سلمہ نے ابو العباس ابن محمد کے بلانے کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ ابو العباس ایک اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور سیاہ لباس پہنے ہوئے اور سر پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ اس نے مسجد میں داخل ہونے کے بعد اذان کے لیے کہا جس کے بعد وہ منبر پر کھڑا ہوا اور حمد و ثنا کے بعد اس نے خطبہ کہا جس میں بہشت و دوزخ کے ذکر کے بعد ثواب و عذاب کا تذکرہ کر کے لوگوں کو نصیحت کی اور پھر منبر سے نیچے آ گیا۔ لوگوں نے اُس کی بیعت کی اور وہ خلیفہ بنایا گیا۔

ابو العباس نے خلیفہ ہونے کے بعد خاندانِ بنی اُمیّہ کی پورے طور سے تباہی کا ارادہ کیا اور مروان الحمار (آخری خلیفہ بنی اُمیّہ) کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنے چچا عبداللہ ابن علیؓ کو روانہ کیا۔ عبداللہ نے موصل سے ہوتے ہوئے دمشق کا راستہ لیا اور دارالسلطنت کے فتح کرنے کے بعد ایک شخص صالح نامی کو مروان کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ جب مروان نے سنا کہ صالح آ رہا ہے تو بھاگ کھڑا ہوا اور مصر کی طرف چلا گیا اور وہاں قسطاس میں جا ٹھہرا، لیکن وہاں سے بھی کوچ کر گیا۔ صالح جو کہ اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا قیوم میں پہنچا اور مروان کی گرفتاری کی تجاویز سوچنے لگا۔ اس نے قیوم کے صاحب الخراج عامر ابن اسماعیل جرجانی کو

ایک ہزار جوان دے کر اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا لیکن مروان اس کی روانگی سے پہلے قسطاس سے ایک اور شہر میں چلا گیا تھا جسے عین الشمس کہتے تھے اور جو کہ فرعون کا مقامِ مخصوص تھا۔ عامر ابن اسماعیل بھی اسی طرف روانہ ہوا اور رات کے وقت شہر میں داخل ہوا اور کیا دیکھتا ہے کہ ایک غلام ایک گھوڑے کی نگرانی کر رہا ہے۔ عامر نے اس سے سوال کیا، یہ گھوڑا کس کا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ''مروان کا''۔ عامر نے کہا۔ ''مروان کہاں ہے؟'' اس نے کہا۔ ''وہ کنیہ میں مقیم ہے۔'' چنانچہ لشکر نے کنیہ کی طرف رخ کیا لیکن جب مروان کو معلوم ہوا کہ غنیم آرہا ہے تو ہتھیار لگا کر سامنے آگیا اور عامر کے لشکر میں سے ایک شخص عبداللہ ابن شہاب نے مروان کو برچھا مارا جو کہ اس کے جسم کے حصّہ مخسی میں لگا اور وہ گر پڑا اور گرتے ہی جان بحق تسلیم ہوا۔ سوار اس کے گرد جمع ہو گئے اور محمد ابن شہاب کے ایک غلام نے گھوڑے سے اتر کر اس کا سر کاٹ لیا جو کہ صالح کے سامنے پیش کیا گیا۔ صالح نے اس کو اپنے بھائی کے ہاتھ عبداللہ ابن علی کے پاس جو کہ فلسطین میں تھا روانہ کر دیا۔ عبداللہ نے امیر المومنین سفّاح کو ایک خط لکھا اور ساتھ ہی مروان الحمار کا سر روانہ کر دیا۔

مروان الحمار کے قتل کے بعد بنی امیّہ کی خلافت ختم ہو گئی۔ ابو العباس نے اپنے چچا داؤد ابن علیؓ کو حرمین کی ولائت دے دی اور کہا، جہاں کہیں بھی بنی امیّہ کا کوئی شخص ہاتھ لگے فوراً قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ داؤد ابن علی روانہ ہو گیا اور جہاں کہیں بھی بنی امیّہ سے کسی ایک کو پاتا قتل کرتا اور ایک ایک گوشہ سے ڈھونڈ کر ان کو تباہ کرتا ۔اسی طرح ابو العباس نے اپنے چچا عبداللہ کو شام میں خط لکھا کہ بنی امیّہ میں سے جس کسی کو پائے قتل کر دے۔ چنانچہ عبداللہ ابن علی نے ان سب کو طلب کر کے قتل کر دیا، یہاں تک بنی امیّہ میں سے کوئی بھی نہ بچا۔ مگر ایک شخص عبدالرحمٰن کسی طریقہ سے چھپ کر افریقہ بھاگ گیا اور پھر وہاں سے ہسپانیہ چلا گیا جہاں وہ بنی امیّہ کی اس شاندار حکومت کا بانی ہوا جس نے اپنی علمی شعاعوں سے یورپ کو منوّر کیا تھا۔ بنی امیّہ کے استیصال کے بعد ابو العباس کے حکم سے خلفائے بنی اُمیّہ کی قبریں کھدوا کر ہڈیاں جلا دی گئیں۔ طبریؒ لکھتا ہے کہ جب یزید کی قبر کھودی گئی تو اس کی ہڈیاں سیاہ تھیں۔

عبرت کا مقام ہے کہ معاویہ نے کس کوشش کے ساتھ خلافت کو اپنے خاندان میں قائم کیا اور پھر اس کی دو پشتوں کے بعد ہی وہ مروانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ان لوگوں نے اس زعم میں کی یہ ہمیشہ ان ہی کی بن کر رہے گی ایسے ایسے کام کیے جو کہ بحیثیت خلیفۃ الاسلام ہونے کے ان کے شایانِ شان نہیں تھے۔ بیشک ان کا زمانۂ الخلافت نہایت شاندار گزرا ہے۔ ایک طرف چین اور دوسری طرف پرتگال تک تمام ملک اسلام کے

قبضۂ اقتدار میں آ گئے اور اس کی وہ شان تھی کہ بعد کے زمانوں میں دیکھی نہیں گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی خلافت سے اسلام کو روحانی فائدہ کیا ہوا۔ جہاں تک تاریخی واقعات کا مطالعہ کیا جاتا ہے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دنیوی لحاظ سے انہوں نے بہت ترقی کی مگر مذہبی لحاظ سے ان کا زمانہ کسی طرح یادگار نہیں رہ سکتا۔ اسلام کا سب سے اوّلین مشن یہ تھا کہ اسے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا جائے۔ آنحضرتؐ نے خلافت کے ایسے ایسے اصول قائم کیے۔ جن کے برتنے سے دیگر اقوام خود بخود اسلام کی طرف راغب ہو جایا کرتی تھیں اور اسلام کی تعلیم کے اندر ہی ایسی باتیں پائی جاتی تھیں جنہیں عملی صورت میں لانے سے کسی قسم کے خطرہ کا خیال آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن افسوس! بنی اُمیّہ نے ان کو بالکل فراموش کر دیا تھا اور صرف اپنی نفسانی خواہشات کی فکر میں رہتے تھے۔

اب خلافت بنی ہاشم کے ہاتھ میں آ گئی اور اس میں بھی قرعہ بنی عباس کے نام پڑا۔ ابوالعباس پہلا عباسی خلیفہ تین سال کی حکومت کے بعد راہی ملک عدم ہوا اور ابو جعفر منصور اس کا جانشین ہوا۔ چونکہ بنی عباس کے حصول خلافت میں ایرانیوں کا بہت زیادہ حصّہ تھا اس لیے اس خلیفہ نے اپنے تدبّر سے ان لوگوں (ایرانیوں) کو ہمیشہ کے لیے اپنا دست و بازو بنانے کے لیے یہ تجویز سوچی کہ بجائے دمشق کے دارالسلطنت ایک ایسی جگہ پر ہو جو کہ عربوں اور ایرانیوں کی تہذیب کی جائے اتصال ہو۔ چنانچہ دریائے دجلہ کے دونوں طرف بغداد کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا اور ایک نہایت ہی عظیم الشان شہر بنایا گیا جس کی شان و شوکت کے گیت کئی صدیوں تک زبان زد خلائق رہے۔

بنی امیّہ کے عہد میں بنی ہاشم کو نشانۂ ظلم و ستم بنایا جاتا تھا۔ اب جبکہ قرعہ بنی عباس کے نام پڑا تو بنی فاطمہ پہلے سے بھی زیادہ مصائب میں مبتلا ہو گئے اور دل کھول کر خلفائے بنی عباس نے ان بیچاروں کا قتل و غارت کرنا شروع کیا۔ ہم بنی عباس کی خلافت پر تبصرہ نہیں کرتے کیونکہ یہ ایک طویل قصّہ ہے جس کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ صرف اس کے متعلق اس قدر یہاں بتایا جاتا ہے کہ اس خاندان کے پہلے چند ایک خلفاء نے نہایت ہی شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی کی اور عیش پسندی میں بنی اُمیّہ سے بھی بڑھ گئے، لیکن اُن جیسا ظلم ان میں نہیں پایا جاتا تھا اور اکثر دیندار بھی تھے۔ مگر آخری زمانہ کے خلفاء کے عہدوں میں ترک، تاتاری اور دیگر پہاڑی قوموں نے اس قدر غلبہ حاصل کیا کہ خلفائے بغداد ان کے ہاتھ میں موم کی ناک ہو گئے اور ایسی طوائف الملوکی پھیلی کہ چپّہ چپّہ پر خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ عثمانی ترکوں نے سب پر غالب آ

کر دنیائے اسلام پر اپنا سکہ بٹھا لیا اور دائرہ فتوحات کو درِ دانیال سے عبور کر کے آسٹریا تک وسیع کر دیا، اور باسفورس کے کنارے قدیم یونانی دارالخلافہ کو اپنا مرکز خلافت بنا کر حرمین شریفین کی خدمات کا ذمہ اٹھالیا۔ مگر افسوس سے کہا جاتا ہے کہ استبداد زمانہ سے یہ بھی نہ بچ سکے اور اب ان کے انحطاط کے ساتھ ہی اسلام کو بہت کچھ ضعف پہنچ رہا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ جل شانہ اُن کی ہستی قائم رکھے اور اسلام کی خدمت کی ویسی ہی توفیق دے جیسی کہ اُنہیں کسی زمانہ میں حاصل تھی۔

بنی عباس اور عثمانی ترکوں کے عروج و زوال کے متعلق ان شاءاللہ العزیز ''الخلافت'' کے دُوسرے حصّہ میں نہایت ہی شرح وبسط کے ساتھ کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

# بارہویں فصل

## مدینہ منورہ سے مرکز خلافت کا انتقال

### تنزّل خلافت کا آغاز

ہم نے کسی گذشتہ فصل میں اس بات کو بوضاحت بیان کیا ہے کہ جزیرۃالعرب میں خلافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھنے کے یہی معنے تھے کہ اس سرزمین کے لوگ نہایت ہی موزوں طریقے سے اس کے اہل تھے۔ان میں حریّت، آزادی، شجاعت، فیاضی اور غیرت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔وہ لوگ چاہے کچھ بھی ہوان اوصاف کو کبھی بھی ہاتھ سے نہیں دیتے تھے اور انہی چیزوں کی خلافت کو بھی ضرورت تھی۔ جس قوم کے ہاتھ میں خلافت کی باگ ہو اگر وہ ان اوصاف سے متصف ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو مطیع نہیں کر سکتی ہے اور مشیّت ایزدی بھی اسی میں تھی کہ خلافت کی عنان انہیں لوگوں کے ہاتھ میں دی جائے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہایت ہی کم عرصہ تک اُن کے قابو میں رہی اور بہت ہی جلدی ہوا و حرص کا شکار ہو کر ان لوگوں کے قبضہ میں چلی گئی جو کہ کسی صُورت بھی اس کے قابل نہیں تھے اور جن میں یہ باتیں نہیں پائی جاتی تھیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر ایک انسان میں اس قسم کے جوہر پائے جاتے ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ کسی میں زیادہ اور کسی میں کم۔ مگر قطع نظر ان سب کے عرب کے لوگ ایک نرالی قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ان میں یہ باتیں اس طور موجود ہیں کہ آپ اس وقت بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ جو حالت ان کی حضرت سلیمانؑ کے وقت تھی وہی حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں پائی گئی، اور وہی سرور کائناتؐ کے عہد مبارک میں دیکھی گئی، اور وہی خلفائے راشدین کے زمانوں میں تھی، اور وہی اس وقت بھی ہے۔

آنحضرتؐ نے خلافت اسلامیہ کی بنیاد اس سرزمین میں رکھ کر دنیا کے تمام ملکوں کو اس کی طرف رجوع کیا۔ چونکہ آپ کا مشن تمام عالم کے لیے تھا اس لیے آپ نے خدائے عزوجل کی مرضی کے مطابق مدینہ منورہ کو مرکز قرار دیا کہ عربوں کی حیرت انگیز شجاعت اور اولوالعزمی سے تمام دنیا کو اخوت کی ایک ہی کڑی میں مُنسلک کر دیا جائے۔ جب آپ نے مکّہ معظمہ فتح کیا تو مدینہ کے لوگوں کو خیال گزرا کہ شاید اب آپ اپنے وطن واپس تشریف لے جائیں اور انہیں داغِ ہجرت دے جائیں۔ لیکن آپ نے ان کا عندیہ معلوم کر کے فرمایا۔

''میں ہر گز مدینہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اُس نے مجھے اس وقت پناہ دی جبکہ میرے وطن والوں نے مجھے تکلیف وایذادے کر نکال دیا۔'' آپ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مدینہ سے کس قدر اُنس تھا کہ اس کے عشق میں اپنے وطن تک کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح ہم شیخین (ابو بکر و عمرؓ) کے عہد دیکھتے ہیں۔ خلیفہ ثانی نے اس سرزمین عرب میں ہی بیٹھ کر تمام دنیا کو مسخر کیا اور ایران، شام، مصر اور عراق کو حلقہ بگوشِ اسلام کر دیا۔ اور پھر مدینہ منورہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو مرکز خلافت کے منتقل کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ وہ جانتے تھے کہ وہی سادہ عرب تمام دنیا کو اسی ریگستان میں بیٹھ کر مطیع کر سکتے ہیں اور جب تک ان کا طریقۂ زندگی اور طرزِ معاشرت وہی رہیں گے، انہیں کوئی طاقت بھی نیچا نہیں دکھا سکے گی اور جونہی وہ اپنی مرزبوم سے الگ ہوں گے ان میں کاہلی، سُستی، عیش و عشرت، وجاہت پسندی اور حکومت کا گھمنڈ اور حاکمانہ تکبّر اور تمکنت آجائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنی پہلے جیسی شجاعت، آزادی، اولوالعزمی، بُردباری، فیاضی، غیرت اور سادگی کو جواب دے کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گے۔ یہی سبب تھا کہ آپ ہمیشہ ان لوگوں کو جو کہ عرب سے باہر فوجی یا ملکی عہدوں پر مقرر ہو کر جایا کرتے تھے اکثر ہدایت کرتے رہتے تھے کہ دیکھنا، اپنی سادگی کی زندگی کو نہ بُھول جانا اور اپنی سابقہ حالتوں کو تبدیل نہ کرنا کیونکہ اگر ایسا کروگے تو یاد رکھو، سب کچھ کھو بیٹھو گے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی نصیحت کو جلدی ہی فراموش کر دیا گیا اور خلافت کا مرکز اس مبارک سرزمین سے اٹھا کر کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا۔

اب جبکہ امیر معاویہ کی مہربانیوں سے مدینہ منورہ کی جگہ دمشق دارالخلافت قرار پایا تو حالت ہی دگرگوں ہوگئی۔ یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی سلطنت کا مرکز ایک ہی جگہ رہتا ہے تو اس جگہ کے اردگرد کے لوگ اس کے امورات میں سب سے زیادہ حصّہ بوجہ قرب کے لیتے ہیں اور حکومت کی کل انہیں لوگوں کے مذاق کے مطابق ڈھالی جاتی ہے، اور ان کے طرز عمل کا اثر سلطنت کے دیگر مقبوضات پر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ خاص مرکز خلافت پر۔ لیکن جب مرکز خلافت کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے، چونکہ سابقہ مرکز کے سب کے سب لوگ جدید مرکز میں نہیں جا سکتے، اور ان میں سے ایک بہت ہی قلیل تعداد نقلِ مکان کرتی ہے اور وہ بھی چند ایک وجوہات کے باعث خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی، تو نئے مستقر کے سبب ان کا ان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو کہ طرز معاشرت میں، اصول تمدن میں اور اس قسم کی دوسری باتوں میں ان سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی ان کی وہ حالت نہیں رہتی جو کہ ان کے اپنے وطن میں تھی بلکہ جدید تمدن

کے غالب ہونے پر وہ اسی جگہ کے لوگوں کے رنگ میں رنگے جانے کے بعد اپنی گذشتہ روایات کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔یہی بات عربوں کو پیش آئی۔جب معاویہ مرکز خلافت دمشق لے گئے تو وہاں وہی عرب جا سکے جو یا تو پہلے ہی سے بہ حیثیت فاتحوں کے گئے تھے یا جو بعد میں وہاں خلافت کی مہربانیوں کی کشش سے جا سکے ۔باقی ماندہ ویسے کے ویسے اپنے اصلی وطن میں رہ گئے۔

جب تک دارالخلافت مدینہ منورہ رہا عرب نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ اس کے امورات میں ہاتھ بٹاتے رہے اور اسے اس طریقہ سے چلاتے رہے جو کہ ان کے مذاق کے مطابق تھا۔ان میں آزادی تھی اس لیے آزادی رائے سے کام لیتے رہے۔وہ شجاع تھے اس لیے جب کبھی کسی ملک کو فتح کرنا ہوتا،نہایت ہی دلیری کے ساتھ اس کے فتح کرنے پر کمر ہمت باندھ لیتے۔مرکزِ خلافت کے نہایت ہی قریب ہونے کے باعث ان کا اثر خلافت کے معاملہ میں پورے طور سے رونما ہوتا رہا۔چونکہ انہیں خلیفہ کی موجودگی کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا اور جانتے تھے کہ ان کے افعال کا نگراں ان کے سر پر ہے،اس لیے زمانۂ جاہلیت کا پرانا اثر کسی صورت بھی ان پر غالب نہیں آ سکتا تھا۔لیکن جونہی خلافت وہاں سے چلی گئی ان کی حالت ہی اور ہو گئی۔پہلے تو خلافت کے امورات میں حصّہ لیتے تھے اور اس لیے سوائے اس کے ان کو کوئی اور شغل نہیں تھا،لیکن اس سے محروم ہونے کے بعد اس کے سوائے اور کچھ نہ کر سکے کہ پھر سابقہ بدویّت کی طرف چلے گئے اور آہستہ آہستہ ان کی وہ حالت ہو گئی جو کہ ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں۔وہ زمانۂ جاہلیت کی طرح کینہ دوز اور بغض و عناد سے پر ہیں۔ان میں وحشت اور درندگی اب بھی ویسی ہی پائی جاتی ہے جیسی کہ اسلام سے پیشتر تھی۔غرضیکہ بالکل وہی صفات ان میں موجود ہیں جو کہ قبل از اسلام ان میں پائی جاتی تھیں۔اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وہ مسلمان ہیں اور خدائے عزوجل کو واحد جانتے ہیں اور بس۔

اگر مرکزِ خلافت مدینہ رہتا تو کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ اپنی پہلی کی سی بدویت کی طرف چلے جاتے۔انہیں خلافت کا قرب حاصل ہوتا،اس کو ویسا ہی آزاد رکھتے جیسا کہ وہ خود تھے،اور اسے کسی شخص کے اقتدار کے اندر نہ آنے دیتے کیونکہ وہ خود کسی واحد ہستی کے زیر اثر نہیں آنا چاہتے تھے۔خلافت کی وہ وہی حیثیت رکھتے جس میں اس کا نشو و نما ہوا تھا۔وہ آزاد منش ہونے کے باعث خلیفہ کو خلافِ شرع اور خلافِ قانون کام کرنے سے روکتے تو خلافت کو وہ دن نہ دیکھنے پڑتے جو اس وقت دیکھ رہی ہے۔وہ شخصیت کے پنجوں سے آزاد رہتی اور جمہوریت اتنا زمانہ گزرنے کے بعد اس درجہ جگہ پکڑ جاتی کہ آج مسلمان دنیا کی آزادی کے علمبردار ہوتے اور پورے طور

سے اسلام کی حقیقی تعلیم دنیا میں پھیلاتے۔

دوسری طرف ان عربوں کی حالت ملاحظہ کیجیے جو کہ شام یا عراق میں گئے تھے۔ یہ بالکل درست ہے کہ رعایا پر حکمران کے طرزِ عمل کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ جب تک خلفائے راشدین سر پر آرائے خلافت رہے، عرب نہایت ہی سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے کیونکہ ان چاروں خلفاء کی طرز معاشرت نہایت ہی سادہ تھی۔ وہ عیش و عشرت سے کوسوں دور رہتے تھے اس لیے رعایا بھی ان کا اتباع کرتی۔ لیکن جس وقت دمشق دارالخلافت بنا تو وہاں خلیفہ بادشاہ بن گیا اور نہایت ہی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اسے وہاں سب قسم کے آرام مہیّا تھے، اور جو عرب فاتحین بھی وہاں گئے ان کے لیے وہ سرزمین بالکل نئی تھی۔ وہاں کے باشندے مطیع تھے اور خلیفۂ وقت کے ہر وقت بندۂ بیدرم تصوّر کیے جاتے تھے اس لیے ان عربوں کو بھی بادشاہ کے دیکھا دیکھی یا یوں کہیے کہ انہوں نے وہ وہ باتیں وہاں پائیں جو کہ انہیں اپنے وطن (عربستان) میں حاصل نہیں تھیں اس لیے عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ اور یہ بات تو اظہر من الشمس ہے، جب کوئی قوم عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے گذشتہ جوہر معطل ہو جاتے ہیں اور فاتح مفتوح کی طرح کاہل اور سُست ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان عربوں پر بھی عیش و عشرت کا ایسا اثر ہوا کہ ان کی عرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی ہوئی حالت اور اس حالت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ دُور کیوں جائیں، آپ ہندوستان میں مغلوں کی حالت ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ جب پہلے پہل وہ فاتحوں کی حیثیت میں شمال کے پہاڑی علاقوں سے آئے، وہ نہایت ہی قوی جثّہ، شجاع اور تلوار کے دھنی تھے لیکن ہندوستان میں مُدت مدید کی سکونت نے ان میں کاہلی اور سُستی پیدا کر دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی سابقہ ہستی کھو بیٹھے اور سلطنت کے جانے کے ساتھ ہی ان کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ اگر وہ انہیں پہاڑی علاقوں میں رہتے تو آرام طلبی اور عیش و عشرت ان کے پاس تک نہ پھٹکنے پاتے۔

اس سے بھی گزر کر جب دمشق کی جگہ بغداد مرکزِ خلافت قرار پایا تو اس نے عربوں کی رہی سہی طاقت کو بالکل ہی ملیامیٹ کر دیا۔ معاویہ نے دمشق میں صرف اس لیے نقل مکان کیا تھا کہ انہوں نے خلفائے راشدین کے عہدوں میں شام کی ولایت پر مامور ہونے کے باعث لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہوا تھا اور انہیں اس طور سے اپنا راز دار بنایا تھا کہ وہ ہر وقت آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں جنگ صفین میں صف آرا ہوئے تو ان کے ساتھ سب سے بڑی تعداد شامیوں کی تھی۔ قطع نظر اس کے دمشق اس لیے بھی دارالخلافہ بنایا گیا کہ حضرت علیؓ سے شکست کھانے کے بعد معاویہ کے لیے سوائے

دمشق کے کوئی اور جائے پناہ نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ حضرت امام حسنؑ کے خلافت سے دست بردار ہونے پر وہ مدینہ منورہ کو ہی واپس آجاتے لیکن عرب کے بہت سے لوگ ان کے مخالف تھے اور وہ جانتے تھے کہ انہوں نے سلطنت ظلم و ستم کے ساتھ حقیقی وارثین کو برطرف کر کے حاصل کی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس وقت وہ لوگ بھی زندہ تھے جنہوں نے حریّت اور آزادی کی آغوش میں پرورش پائی تھی، اس لیے وہ کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ خاندان بنی اُمیّہ کے امیر کہلائیں۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ خلافِ شریعت طرز عمل جس میں انہیں شام میں کامیابی ہوئی ہے خاص عربستان میں ان کے لیے نہایت ہی خطرناک تھا۔ انہوں نے شامی لوگوں پر اس قدر اقتدار حاصل کیا ہوا تھا کہ جو کچھ وہ (معاویہ) انہیں کہتے وہ یقین کر لیتے۔ مثلاً معاویہ کا معمول تھا کہ خطبہ کے دوران میں منبر پر حضرت علیؓ کو تبرّا بھیجتے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ وہ مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے اور ان کا ارادہ ہوا کہ اسی طرح وہاں بھی منبر پر حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہیں۔ لوگوں نے کہا، اگر آپ نے حضرت سعد ابن وقاص کی اجازت کے بغیر ایسا کام کیا تو سخت فساد کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ معاویہ نے حضرت سعدؓ سے اس کے متعلق استفسار کیا۔ سعدؓ نے فرمایا، ''اگر تو ایسا کام کرے گا تو میں یہاں سے اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔'' معاویہ خاموش ہو گئے اور تبرّا کہنے سے باز رہے۔ اسی نوع کے واقعات ہمیں بتلا رہے ہیں کہ انہیں عربستان میں کسی طرح سے بھی کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن بنی عباس کی پالیسی بغداد کے دارالخلافہ بنانے میں کسی اور طریقہ میں رونما ہو رہی تھی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی غرض پر بیٹھا ہوا تھا، کسی کو بھی اسلام کی اگر ترقی مقصود ہوتی تو ناممکن تھا کہ جزیرۃ العرب کے سوا کسی اور جگہ کو مرکزِ جمعیت اسلامیہ بنایا جاتا کیونکہ گذشتہ واقعات سے معلوم ہوا ہے کہ مدینہ منورہ سے خلافت کو دوسری جگہ لے جانا اسلام کے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوا۔ وہ عرب، وہ سادہ عرب جو کہ اسلام کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے تھے اب ایسے غافل ہوئے کہ سب کچھ فراموش کر کے پھر سابقہ بدویت میں چلے گئے۔

جب ابوالعباس کے بعد ابو جعفر منصور خلافتِ اسلامیہ کا مالک ہوا تو اسے اس بات کا خیال گزرا کہ اس کے استحکام کے لیے ایک ایسی تجویز بہم پہنچانی چاہیے جس سے خلافت ہمیشہ تک بنی عباس کے خاندان میں ہی رہے۔ چونکہ بنی عباس کے سب سے زبردست حامی اہل ایران تھے اور انہیں کی ہی مدد سے انہوں نے حکومت حاصل کی تھی، اس لیے انہیں کو اب بھی اپنا مددگار بنانے کے لیے اس نے دارالسلطنت بغداد کی بنیاد رکھی جو کہ

عرب وایران کی حد پر تھا۔اس سے اس کا یہ مقصد تھا کہ ایک طرف تو آزادی اور حریّت کے دلدادہ عرب اس کے قابو میں رہیں گے اور دوسری طرف ایرانیوں کو سلطنت کے اہم امورات میں ہاتھ بٹانے کے مواقع حاصل ہو جائیں گے۔

لیکن بنی عباس کے اس قسم کے طرز عمل سے انہیں ذاتی فائدہ تو حاصل ہو گیا، یعنی خلافت اسی خاندان میں قائم ہو گئی، مگر دمشق کی نسبت یہاں اہل عرب کی ہستی کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور امورات ملکی میں ان کا دخل بالکل نہ رہا۔ ہر ایک صیغہ میں ایرانی ہی بھرتی ہونے لگے۔ وہی خلفاء کے وزراء، وہی سرِ عسکر، اور وہی علوم و فنون کے حامی ہو گئے۔ انہوں نے خلفاء پر اس قدر قابو حاصل کر لیا کہ حضر و سفر میں وہ ان کے ہمراہ رہتے اور ہر وقت ان کی مصاحبت خلفاء کے لیے خوشی کا باعث ہوتی۔ خلفاء ان کے ایسے قبضۂ اقتدار میں آ گئے کہ وہ لوگ جس طرح چاہتے ان سے سلوک کرتے، اور تمام دنیائے اسلام پر عجمیوں کا ہی دور دورہ ہو گیا جس سے عرب ہمیشہ کے لیے تاریکی کے پردہ میں آ گئے۔

رنج اس بات کا ہے کہ شروع میں ہی اسلام کو کیسے کیسے انقلابات دیکھنے پڑے۔ وہ خلافت جس کی مقدس بنیاد دنیا کے بہترین انسان کے ہاتھ سے رکھی گئی تھی کس طرح بعد کی نسلوں کے ہاتھ سے غارت ہوئی۔ خلافت کا مدینہ منورہ سے انتقال کرنا گویا دنیا سے انتقال کرنا تھا۔ پھر اسے وہ شان دیکھنی نصیب نہ ہوئی جو کہ حضرت عمرؓ کے عہد زرّیں میں اُسے حاصل تھی۔ معاویہ نے اُسے ایسا بے گھر کیا کہ اب تک آوارۂ وطن ہو رہی ہے اور اس بیچاری کے کہیں بھی پاؤں نہیں جمتے۔ مدینہ میں اس کی نشو و نما ہوئی اور معراجِ کمال تک پہنچنے کے بعد اسے دمشق میں نقلِ مکان کرنا پڑا۔ لیکن بیچاری کو کچھ زیادہ مدت وہاں آرام کرتے نہیں گزرا تھا کہ اس کا ایک حصّہ بغداد پہنچا اور دوسرا ہسپانیہ گیا۔ امتدادِ زمانہ سے ہسپانیہ والے حصّہ کو وہاں سے بُری طرح دھکّے ملے اور وہ فنا کی آغوش میں سو گیا۔ مگر جب بغداد والا حصّہ دمِ آخرین پر پہنچا تو کتنوں نے ہاتھ پاؤں مار کر کبھی اُسے پھر دمشق پہنچانے کی کوشش کی اور کبھی اسے مصر لے جانے میں سعی کی، اور آخر کار اس کشمکش میں وہ قسطنطنیہ پہنچی جہاں تقریباً چھ سو سال کے پُر شان قیام کے بعد اب آخری سانس لے رہی ہے۔ افسوس! جب سے اس مظلوم نے قربِ سرور کائنات چھوڑا، خوار و خستہ حال ہی ہو رہی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس آقائے نامدار کے قدموں میں ہی رہتی جس کی برکت سے اُسے وہ عروج حاصل ہوا کہ وہاں ہی بیٹھی بیٹھی قیصر و کسرلے کے سر اپنے سامنے جھکاتی تھی۔

# تیرھویں فصل

## مُدعائے خلافت

## فرائضِ خلیفہ

خدائے عزوجل قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے، ''ہم نے انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کرے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن وانس کے پیدا کرنے کا یہ مُدعا تھا کہ خدا تعالیٰ کی توحید پھیلائی جائے اور اس کے نام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا جائے۔ پھر ساتھ ہی انسان کو خلیفہ بنانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نام سے دنیا کا نظام قائم کر کے اس کی وحدانیت اور الوہیت کا چرچا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جل شانہ، وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم السلام دنیا میں معبوث کرتا رہا تاکہ وہ لوگ جو خدائی عبادت کے زرّیں اصولوں کو پسِ پشت ڈالتے تھے ان کو پورے طور سے ہدایت کی جائے اور بتایا جائے کہ انسان کی پیدایش کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کی تسبیح و تقدیس وردِ زباں ہو۔ لیکن چونکہ اس ذاتِ بابرکات نے دنیا کو قائم رکھنا تھا اس لیے اس کے نظام کو بھی عبادت میں داخل کر کے جہاں اپنی عبادت کے طریقے بتائے وہاں اصول معاشرت اور اصولِ تمدن سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا تاکہ وہ ان کے مطابق دینی و دنیوی امورات کو انجام دے کر سعادتِ دارین سے بہرہ یاب ہوں۔

جب آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو وہ اپنے ساتھ دُہرا مشن لائے۔ ایک یہ کہ خدائے واحد کی توحید پھیلائی جائے اور دوسرے ایک ایسا نظامِ عمل قائم کریں جو کہ انتظامِ مملکت کے لیے از بس ضروری ہے اور جس کے بغیر خدائے برتر و توانا کی عبادت و پرستش اچھی طرح نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے زبان سے ہی ارشادات نہیں فرمائے بلکہ اپنی ذات سے کر کے دکھلایا کہ ان پر کس طرح عمل ہو سکتا ہے اور یہ کہ آپ کے جانشین کو کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ اللہ جل شانہ کی توحید لوگوں کے دلوں میں مضبوطی کے ساتھ جائے گزین ہو۔ چنانچہ سرورِ کائناتؐ نے شروع شروع میں صرف لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرایا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ ہر ایک قسم کے کفر و الحاد اور فسق و فجور سے پاک ہو کر صرف خدائے واحد کے سامنے سر

جھکائیں۔ جب آپؐ کی بے لوث تعلیم سے بہت سے لوگ آپؐ کے حلقہ بگوش ہو گئے تو آپؐ نے خیال کیا (جو کہ ارشاد خداوندی تھا) کہ اللہ جل شانہ کے نام کو چونکہ دنیا میں ہر جگہ پھیلانا ہے، اس لیے اگر ضرورت ہو تو ان روکاٹوں کے دُور کرنے کے لیے جو کہ آپؐ کے اشاعتِ توحید کے راستے میں حائل ہو رہی تھیں، تلوار سے کام لیا جائے کیونکہ ایسے موقع پر تلوار ہی کار گر ہو سکتی ہے (اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تلوار سے لوگوں کو مسلمان کیا جائے بلکہ ان روکاٹوں کو ہٹا دیا جائے جو کہ اسلام کی سادہ اور پاکیزہ تعلیم کے ذریعہ سے لوگوں کو مسلمان بنانے کے راستہ میں حائل تھیں)۔ چنانچہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے آپؐ نے متعدد جہاد کیے اور اپنی زندگی میں ہی سارے کے سارے عرب کو حلقہ بگوشِ اسلام کر لیا اور عملی مثال قائم کر کے بقایا کام اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑ گئے جن میں سے چار پہلے خلفاء کے عہدوں میں تقریباً نصف دنیا میں اسلام کا ڈنکہ بجنا شروع ہو گیا۔[1]

اس لیے معلوم ہوا کہ خلافت کا سب سے بڑا مدعا یہ ہے کہ اشاعتِ اسلام اور توحید الٰہی کو ترقی دی جائے۔ خلیفہ کے فرائض میں سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ ہر وقت اسی خیال میں مصروف ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ اسے ہر وقت یہی دھن رہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو دنیا سے کفر و شرک دُور کر کے اس کے خالص نام کا چرچا کیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد جب سر زمین عرب میں بہت سے لوگ مرتد ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے نہایت ہی ضروری حکم کو فراموش کر کے زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے لگے تو باوجود اس بات کے کہ ان لوگوں کی تعداد حد سے زیادہ بڑی ہوئی تھی، حضرت ابو بکر

---

[1]۔ مخالفین کا اسی سبب سے مسلمانوں پر اعتراض ہوا کرتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ اس کے متعلق ہم نے کسی گذشتہ فصل میں معمولی سا ذکر کیا ہے۔ شاید کہ اس سے یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ اسلام ان معنوں میں بزور شمشیر نہیں پھیلا جن معنوں میں مخالفین خیال کرتے ہیں۔ اور اگر بفرض محال وہ باوجود تسلی کے اس بات پر مصر ہیں تو ہم ماننے کے لیے بھی تیار ہیں کہ ایسا ہی ہے۔ اگر بادشاہ وقت اپنے کسی قانون کو جاری رکھنا چاہتا ہے تو وہ طریقے برتے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ بذریعہ اعلان مطلع کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں قانون پر عملدرآمد کرنا ہر ایک فرد ورعایا پر ضروری ہے، اور اگر کئی ایک لوگ اس سے انکار کرتے ہیں تو چونکہ وہ شاہی قانون ہے اس لیے پھر دُوسرا طریقہ زبردستی منوانے کا استعمال میں لایا جاتا ہے۔ کیا ایک ایسا قانون جو کہ خدائے تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اس دنیوی قانون سے کم درجہ رکھتا ہے جس کے ماننے کے لیے لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر اس کے منوانے میں تلوار کا استعمال کیا جائے تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ (مصنف)

صدیقؓ خلیفہ اول نے تہیّہ کر لیا کہ میں ان لوگوں کو یا تو زکوٰۃ دینے پر مجبور کروں گا یا اگر نہ مانے گے تو ایک ایک کو جان سے ہلاک کر دوں گا۔ مصلحتِ وقت کے لحاظ سے آپؓ کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ فی الحال آپؓ خاموش رہیں کیونکہ اس وقت اسلام نرغہ میں پھنسا ہے، لیکن آپؓ نے نہایت ہی دلیرانہ جواب دیا، ''اگر تم لوگ اس حکم الہٰی کے منوانے کے لیے میری مدد نہیں کروگے تو میں اکیلا ہی ان سے جنگ کروں گا اور خدا تعالیٰ کے راستہ میں اپنی جان دے دوں گا۔'' پھر کیا تھا، جوں ہی انہوں نے آپؓ کی اس بلند حوصلگی اور مستعدی کو دیکھا، مرتدین کے قلع قمع پر تیار ہو گئے اور سرزمین عرب کو ان ناپاک ہستیوں سے فوراً ہی پاک کر دیا۔ کس چیز نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اس بات پر مجبور کیا تھا؟ اسی اشاعتِ اسلام کی تعلیم نے۔ وہ جانتے تھے کہ نظامِ عالم قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ لوگ توحید کی ایک ہی زنجیر میں کڑیوں کی طرح نہ جکڑے ہوئے ہوں، اور اس لیے انہوں نے بہ حیثیت خلیفۂ اسلام ہونے کے اپنا فرض جانا کہ وہ خواہ کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں سے منوائیں اور اس میں کسی قسم کی غفلت نہ کریں۔

اس کے بعد آپ کے پیشِ نظر حضرت فاروق اعظمؓ کا زمانہ ہے۔ انہوں نے ایران، شام، عراق و مصر کو جو فتح کیا تو کس لیے؟ صرف اس لیے کہ ان ملکوں میں خدائے عزوجل کی توحید کی اشاعت کی جائے جس کے لیے اس نے نبیؐ کو دنیا میں مبعوث فرمایا۔ آپ فتوحاتِ فاروقیؓ کے مطالعہ سے دیکھ سکتے ہیں کہ لشکر فاروقی جہاں کہیں بھی جاتا تھا صرف تین باتیں دشمنانِ اسلام کے سامنے پیش کرتا تھا۔ ایک دعوت اسلام، دُوسرے اطاعت و جزیہ کی ادائیگی، تیسرے تلوار۔ انہوں نے اپنے آقائے نامدار کی صحبت کا فیض حاصل کیا ہو تھا۔ جس سے انہیں یہ سبق ملا تھا کہ دین اسلام کو دنیا میں پھیلانا ہے، اور واقعی ہے بھی یہی بات۔ اگر ایسا ہے نہیں تو پھر خلیفہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آنحضرتؐ کی بعثت کافۃ الناس کے لیے تھی اس لیے آپ کے جانشینوں کا فرض تھا کہ آپ کا مشن کافۃ الناس کے گوش گزار کیا جائے۔ بدنیوجہ اگر کوئی خلیفہ اس اہم فرض سے غفلت کرتا ہے تو وہ اس قابل ہے کہ خلافت کے منصبِ اعلیٰ سے برطرف کیا جائے اور اس کی جگہ ایک ایسے خلیفہ کو دی جائے جو کہ فرض منصبی کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔

آنحضرتؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء راشدین کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ اشاعتِ اسلام کے بعد خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگ جو کہ قوانین الہیہ (حلقہ بگوش اسلام) کے تحت میں آ گئے ہوں ان کو ان قوانین پر عملدرآمد کرنے پر مجبور کیا جائے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے خلیفہ کی ہستی از

بس ضروری ہے۔ بلاانکار اللہ جل شانہ نے قرآن مجید میں دو قسم کے احکام ارشاد فرمائے۔ بعض تو وہ ہیں کہ جن پر عمل ضروری ہے اور جن کے بجالانے سے بہت بہت انعام واکرام کے وعدے دیے گئے ہیں، اور بعض وہ ہیں جن سے منع فرمایا ہے اور جن کے کرنے سے عذاب کے خوف سے ڈرایا ہے۔ لیکن باوجود اس کے لوگوں کے طبائع مختلف قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ بعض لوگ ان احکام پر بلا روک وٹوک عمل پیرا ہوتے ہیں اور انہیں کسی قسم کے دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی، اور بعض ایسے ہیں کہ جب تک اُن پر دباؤ نہ ڈالا جائے وہ احکام الہیہ کے ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اور اگر اس دوسری قسم کے لوگوں کو اپنے حال پر ہی چھوڑ دیا جائے تو خطرہ ہے کہ ان لوگوں کے افعال ذمیمہ کے باعث ان لوگوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے جو کہ ان احکام کی پیروی بلا حیل و حجت کرتے ہیں اور اس لیے نظام عمل میں رخنہ اندازی ہوتی ہے۔ چنانچہ خلیفہ کا فرض ہے کہ جو لوگ قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کریں، انہیں ایسی ایسی سزائیں دی جائیں کہ دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہوں اور کسی کو جرأت نہ ہو کہ آیندہ ایسے افعال کے مرتکب ہوں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسلام کے اصول ہی کچھ اس قسم کے ہیں کہ محکومیت میں ان کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اسلام نے زنا اور شراب کے لیے چند ایک سزائیں مقرر کی ہیں اور بتایا ہے کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص زنا کرے تو شادی شدہ ہونے کی حالت میں اسے سنگسار کیا جائے اور اگر شراب پیئے تو اُسے دُرّے لگائے جائیں (جن کی تعداد غالباً اسی (80) تک کی ہے)۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے سزائیں کون دے گا؟ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ خلیفۂ وقت۔ اور اگر مجرم مسلمان خلیفۂ وقت کے اقتدار کے باہر ہے اور ایک ایسے قانون کے تحت میں ہے جو کہ اس قسم کے جرم کے لیے کسی قسم کی سزا ہی نہیں دیتا تو پھر بتائیے کیا ہو گا۔ یہ کہ اسلام کا ایک قانون بیکار رہے گا اور قرآن مجید کی ایک فرضیت کی ادائیگی سے مسلمان محروم رہیں گے جس سے کفر لازم آنے کا اندیشہ ہے۔ اسلام کا مجموعۂ قوانین قرآن مجید اور احادیث مقدس ہے۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اس پر عمل کرے اور اگر اس کے کسی ایک قانون کو بھی ترک کرتا ہے تو گنہگار ہے۔

اکثر غدّار اور دنیا پرست مسلمان کہتے ہیں کہ خلیفہ لوگوں پر صرف مذہبی اقتدار رکھ سکتا ہے اور اسے سیاسی معاملات میں کچھ دخل نہیں ہے۔ ذرا وہ غور کریں اور سوچیں کہ ان کے ایسے لغو خیالات کس درجہ صحت پر مبنی ہیں۔ ان کے الفاظ میں تو خلیفہ وہی حیثیت رکھتا ہے جو کہ عیسائیوں میں پوپ روما کی ہے۔ اس قماش کے لوگوں کو آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ کس طرح لوگوں کے دینی اور

دنیوی امورات کو انجام دیتے تھے، اور اگر کوئی شخص بھی مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرتا تھا تو کس طرح اسے سزا دے کر اس کی بُری مثال کے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی بربادی کا ایک یہ سبب بھی ہے کہ مغربیت کے اثر نے ان میں بے جا آزادی ڈال دی ہے اور خلیفۂ اسلام کے اقتدار کے باہر ہونے کے سبب ان کے سر پر سے ایک زبردست ہاتھ ہٹ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علانیہ طور سے ان افعال کے مرتکب ہونے لگے جو کہ شریعت اسلام کے منافی ہیں اور جن کے لیے اسلام نے نہایت ہی سخت سزائیں مقرر کی ہوئی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد مبارک میں ایک دفعہ والئ مصر نے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں تحریر تھا کہ ایک شخص مسلمان ہے لیکن لوگوں میں اسلام کے خلاف ایسی لغو باتیں پھیلاتا ہے جس سے اندیشہ ہے کہ رعایا کے خیالات بگڑ جائیں اور وہ دائرہ اسلام سے نکل جائے۔ خلیفہ ثانی نے حکم دیا کہ اس شخص کو میرے پاس مدینہ منورہ بھیج دیا جائے۔ والئ مصر نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے باحفاظت مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ جب وہ حضرت عمرؓ کے حضور پیش ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا، کیا تو ہی وہ شخص ہے جس کی بابت والئ مصر شکایت کرتا ہے۔ اس نے کہا، جی ہاں! آپ نے اُس کا کچھ عذر نہ سنا اور حکم دیا کہ درّہ لایا جائے۔ جب غلام نے پیش کیا تو آپ نے اُسے پیٹنا شروع کیا اور اس قدر پیٹا کہ نیم مردہ ہو گیا۔ جب اچھی طرح سے اس کی درگت بنی تو کہنے لگا، ''امیر المومنین! اب معاف کیجیے، وہ شیطان جو کہ میرے اندر داخل ہو کر مجھ سے ایسی ایسی لغو باتیں کہلاتا تھا نکل گیا ہے اور اب میں بالکل خوش عقیدہ ہو گیا ہوں۔'' آپ نے اسے مصر روانہ کر دیا اور والی کو لکھ بھیجا کہ کچھ مدت اسے لوگوں سے علیٰحدہ رکھا جائے تاکہ اس کے خیالات کما حقہ درست ہو جائیں۔ یہ ہیں خلیفہ کے فرائض۔ آپ نے کس طرح ایک عالم گیر طوفان روکا اور ایسا روکا کہ پھر وہ کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر وہ ملک خلیفۂ وقت کے زیر اقتدار نہ ہوتا تو خدا جانے کیا کچھ ہوتا اور کس قدر لوگ کفر والحاد میں مبتلا ہو جاتے۔

آنحضرتؐ خود بدولت مسلمانوں کے مذہبی رسومات انجام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی کو بھی مقرر نہیں کیا۔ صرف اسی وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کو حکم دیا کہ وہ امامت کرائیں جبکہ آپ مرض الموت میں مبتلا ہونے کے باعث مسجد میں تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ آپ کے بعد خلفائے ارشدین بلکہ خلفائے بنی اُمیّہ تک خود امامت کراتے رہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے لیے یہی امامت ہے جو کہ طغرائے امتیاز ہے۔ اور خلفائے راشدین کا طرز عمل ثابت کرتا ہے کہ خلیفہ کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ علم

دین کا سب بڑا عالم ہو۔ اسے اسلام کے ہر ایک مسئلہ پر پورا پورا عبور ہو اور ہر ایک امرِ شریعت پوری طرح انجام دے سکے۔ چونکہ وہ مسلمانوں کا امام اور امیر ہے اس لیے اس میں لوگوں کی امامت کی تمام صفات پائی جائیں۔ جس وقت مذہبی معمّہ درپیش ہو اس وقت وہ ان کا پیشوا، جب سیاسی معاملہ سامنے آئے تو ان کا سب سے بڑا مدبّر، اور جب جنگی مسئلہ پیش آئے تو اس وقت وہ سب سے بڑا جرنیل ثابت ہو۔ اس کا کام یہ تو نہیں کہ مسلمانوں کے کاموں کو اسی طرح چھوڑ کر رات دن محلات میں عیش کرے اور دنیا و مافیہا کی اسے خبر تک نہ رہے۔ افسوس مسلمانوں نے جب بے جا طور سے خلافت کو غصب کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کے ضروری فرائض کو بھی فراموش کر دیا۔ چونکہ خلافت کا سب سے بڑا فرض امامت ہے اس لیے آنحضرتؐ نے اسے صرف اپنے ہی خاندان میں قائم نہیں رکھا بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے اسے چھوڑ دیا کہ قریش میں سے جسے قابل جانیں خلیفہ بنالیں۔ ہم نے کسی دوسری جگہ بھی ذکر کیا ہے کہ اگر آنحضرتؐ خلافت اپنے ہی خاندان میں قائم رکھتے تو یہ ایک قسم کی مثال قائم ہو جاتی اور صرف آپ کے خاندان میں سے ہی خلیفہ کا انتخاب ہوتا جس سے ممکن تھا کہ کسی نا قابل کے ہاتھ اس کی باگ آ کر اس کی اہم ذمہ داریوں سے غفلت ہو جاتی۔ لیکن معاویہ کی کوشش سے مسلمانوں میں ایک نئی بدعت آ گئی کہ خلافت ایک ہی خاندان میں مخصوص ہو گئی اور باپ کے بعد بھائی یا بڑا لڑکا خلیفہ ہونے لگا، اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ خلیفہ اپنی زیست میں ہی اپنا ولی عہد مقرر کر کے اس کے لیے بیعت لیتا۔ چونکہ لوگ مجبور ہو جاتے تھے اس لیے جبراً و قہراً بیعت کر لیتے اور نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ خلافت ذاتی ملکیت بن گئی، اور ایک ہی خاندان میں رہنے لگی اور اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ انتخاب شدہ خلیفہ آیا امامت کے قابل ہے یا نہیں۔ اب اگر خلیفہ عالم ہوتا تو خود امامت کی تکلیف گوارا کرتا (بشرطیکہ عیش و عشرت سے اسے فرصت ملتی)، ورنہ اپنی طرف سے شیخ الاسلام مقرر کر دیتا جو کہ مذہبی رسومات ادا کرتا جس سے آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ ایک نیا عہدہ (شیخ الاسلام کا) معرضِ وجود آ گیا اور خلفاء نے بالکل ہی امامت سے کنارہ کشی کر لی۔ پہلے تو وہ لوگوں کے نزدیک رہ کر ان کے حالات سے آگاہ رہتا اور مناسب انتظام خود کرتا۔ اب اُن سے الگ رہنے کے باعث ان کے حالات سے بالکل بیگانہ ہو گیا۔ خالدؓ کے الفاظ یاد کیجیے جبکہ وہ روم کے دربار میں بحیثیت سفیر گئے تھے تو رومیوں کے سپہ سالار نے اپنے بادشاہ کی تعریف میں کہا۔ ''ہمارا بادشاہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔'' تو انہوں نے اسے روک دیا اور کہا ''اگر ہمارے امیر کو ایک منٹ کے لیے بھی بادشاہی کا خیال گزرے تو ہم اسے فوراً معزول کر دیں۔'' اگر خالدؓ زمانہ مابعد میں زندہ ہوتے جبکہ خلفاء شانِ فرعونیت رکھتے تھے تو انہیں اپنے

الفاظ کی وقعت معلوم ہوتی۔ صحابہؓ تو خلیفہ کی ہستی کچھ اور سمجھے ہوئے تھے اور بعد میں کچھ اور کی اور ہو گئی۔

خلیفہ کے لیے نہایت ہی ضروری ہے کہ خود مسلمانوں کی امامت کرائے۔ وہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کبھی بھی نماز کے نزدیک تک نہ گیا ہو اور رات دن عیش و عشرت میں مشغول رہے۔

اس سے بھی گزر کر خلیفہ کا ایک اور فرض خلفائے راشدین کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حج کے موقعہ پر قافلہ سالار کی حیثیت میں مکہ معظمہ جائے اور بذاتِ خود مناسکِ حج کی ادائیگی میں حصّہ لے کر لوگوں کی رہنمائی کرے، اور اطراف واکناف کے مسلمانوں سے ملاقات کر کے ان کی شکایات کو عمال کے روبرو سُن کر ان کا سدّباب کرے۔ حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں میر حجاج بن کر مکہ معظمہ تشریف لے جایا کرتے تھے اور اپنے کل عمال کو حکم دیتے کہ وہ بھی وہاں حاضر ہوں۔ جب حج سے فراغت حاصل کرتے تو عمال کے روبرو لوگوں کی شکایات سُن کر ان کی دادرسی کرتے اور اسی جگہ عمال کو مناسب سزا بھی دیتے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہ گویا سلطنتِ اسلامیہ کی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) کا سالانہ اجلاس ہوا کرتا تھا جس میں تمام دنیائے اسلام کے معاملات طے پاتے۔

خلیفہ کے لیے یہ بھی نہایت ہی لازمی امر ہے کہ رعایا کی نگہبانی اور نگرانی کرتا رہے۔ اللہ جل شانہ نے کروڑہا بندگانِ خدا کو اس کے قبضہ میں دے دیا ہے اور اسے ان پر حکومت کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت ان کی حفاظت کے سامان مہیّا کرتا رہے اور رعایا کی تکلیف کے معلوم کرنے کے بعد اسے رفع کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ایک طرف اللہ جل شانہ نے خلائق پر اس سے حکومت کی عزّت عطا کی ہے تو دوسری طرف قیامت کے روز اس سے نہایت ہی سختی کے ساتھ بازپرس کے لیے کہا ہے۔ ہمیں تاریخی واقعات کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جب تک خلفاء سادہ زندگی بسر کرتے رہے وہ اس اہم ذمہ داری کو محسوس کرتے رہے جو کہ رعایا کی نگہبانی اور نگرانی میں مضمر تھی۔ لیکن جب ان میں عیش و عشرت کا دور دورہ ہو گیا تو اس فرض کو فوراً فراموش کر گئے، اور نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا پر ظلم و تعدّی ہونے لگی اور حکومت میں بدانتظامی پھیل گئی۔ خود غرض اور حریص اہلکاران خلافت رعایا پر ستم کرنے لگے اور خلیفہ کو خبر تک بھی نہ ہوا کرتی تھی کیونکہ وہ محلات میں عیش و عشرت میں مشغول رہتا۔ مظلوم رعایا کی چیخ و پکار اس کے کان میں کب پہنچ سکتی تھی۔ محل کے ارد گرد ہزاروں فوجیوں کے پہرے، دروازوں پر ہزاروں حاجب و دربان جس سے ممکن نہیں تھا کہ کوئی شکایت اس تک پہنچے۔ آخری خلیفہ معتصم عباسی کا یہ حال تھا کہ سینکڑوں حسینانِ پر

بجمال و معشوقانِ زہرامثال کے جھرمٹ میں بیٹھا ناچ ورنگ کی مجلسیں جمائے ہوئے ہے۔ شراب کا دور چل رہا ہے، زرنگار تخت پر جلوہ فرما ہے اور جنت کا لُطف اٹھا رہا لیکن خاص دارالسلطنت بغداد میں شیعہ سنیوں سے، شافعی حنبلیوں سے الجھ رہے ہیں، اور آج اگر حنبلی شافعیوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں تو کل سُنّی و شیعہ ایک دوسرے کا گلہ کاٹ رہے ہیں۔ لیکن امیر المومنین خلیفۃ المسلمین کو خبر تک نہیں کہ سلطنت میں کیا ہو رہا ہے۔ اور اگر بھولے سے خبر بھی ہوتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ ہمیں تکلیف نہ دو اور ہمارے عیش و آرام میں مخل نہ ہو، اور فرماتے ہیں کہ اگر شیعوں کو سنیوں نے ان کے محلے پر حملہ کر کے قتل کیا ہے تو ضرور ہے کہ شیعوں نے انہیں اشتعال دلایا ہوگا۔ اچھا کیا کہ سُنیوں نے ایسا کیا اور اسی طرح کے الفاظ کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ پھر اسی مجلس طرب میں تشریف فرما ہو جاتے ہیں۔ غور کیجیے، خلیفہ ہے، مسلمانوں کا امیر ہے، رعایا کی بہتری و بہبودی کا ذمہ وار ہے، لیکن خود عیش میں مشغول ہے اور رعایا کی تکالیف کی اسے خبر تک نہیں۔

اگر خلیفہ سمجھے تو اس کی ذمہ داریاں اس قدر اور اتنی وسیع ہیں کہ مملکت کے چپہ چپہ سے اسے آگاہی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اگر ایک معمولی سی بات سے بھی غافل ہوگا تو اس کے لیے اس کو خدائے عزوجل کے حضور جواب دہ ہونا پڑے گا۔ مولانا[2] جلال الدین ایک جگہ اپنی مشہور کتاب ''اخلاق جلالی'' میں فرماتے ہیں، بنی اُمیّہ کے شہرۂ آفاق خلیفہ حضرت عمر وابن عبدالعزیز کے فوت ہونے کے بعد آپ ایک رات کسی شخص کے خواب میں آئے۔ اس شخص نے عرض کی، امیر المومنین، اللہ جل شانہ نے آپ کو بخش دیا ہوگا اور بڑے بڑے انعام و اکرام کیے ہوں گے کیونکہ آپ نے دنیا میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اور رعایا کی نگہبانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے واقعی میرے تمام گناہ معاف کر دیئے اور مجھے بہشت میں جگہ دی لیکن صرف ایک سال تک مجھے عذاب میں رکھا اس لیے کہ میرے عہد حکومت میں ایک دُور دراز مقام پر ایک پُل تھا جو کسی قدر شکستہ ہو گیا ہوا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اتفاقاً ایک روز ایک بکری اس پر سے گزر رہی تھی تو اس کی ٹانگ اس شکستہ جگہ میں پھنس کر ٹوٹ گئی جس کا عذاب میرے سر رہا اور جس کے سبب خدائے عزوجل نے مجھے ایک سال عذاب دیا۔ دیکھئے، رعایا کی نگہبانی خلیفہ کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

جس بادشاہ نے نہایت ہی کوشش کے ساتھ رعایا کے حالات سے آگاہی حاصل کی اس کی سلطنت کو ضرور

---

[2] مولانا جلال الدین (یہ جلال الدین رومی نہیں ہیں)

بضرور قیام ہے اور رعایا بھی اس سے نہایت ہی خوش رہتی ہے کیونکہ وہ ان کی امانتوں میں خیانت نہیں کرتا اور انہیں کے آرام و آسائش پر بیت المال کا روپیہ خرچ کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ رعایا کی نگہداشت اور ان کے حالات سے پُوری پُوری واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ان کے بیت المال کے روپیہ کا مصرف نہایت ہی احسن طریقہ میں کیا کرتے تھے اور مجال نہیں تھی کہ ایک کوڑی بھی ضائع جائے۔ ان کے اس کے متعلق طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال مسلمانوں کی ملکیّت ہے اور خلیفہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس کا امین ہے اور ایک پیسہ تک بھی رعایا کی مرضی کے خلاف صرف نہیں کر سکتا۔ اگر اسے ذاتی ضروریات کے لیے روپیہ درکار ہو تو رعایا کی اجازت حاصل کرے نہ کہ خود بخود جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو خزانۂ عامرہ سے لے کر خرچ کر ڈالے۔ خلفائے بنی عباس اور بنی امیّہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی ذات پر انہوں نے بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ قصر و محلات تعمیر کرائے اور اپنے آرام کے وہ وہ سامان بہم پہنچائے کہ سُن کر عقل حیران ہوتی ہے۔ محلّات شاہی میں سینکڑوں کیا لاکھوں کی تعداد میں لونڈی غلام ہوا کرتے تھے اور ان سب کے اخراجات بیت المال سے ادا ہوا کرتے تھے۔ ان خلفاء کے درباروں میں شاعر خاص طور سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے جو بادشاہ کی مدح سرائی میں ایک ایک قصیدہ کے صلہ میں لاکھوں روپیہ کے انعامات حاصل کرتے جو کہ خزانۂ عامرہ سے ادا کیے جاتے۔ اگر یہ خلفاء خلفائے راشدین کا طرزِ عمل پیش نظر رکھتے تو کبھی بھی فضول خرچی اور خیانت میں نہ پڑتے۔ حضرت عمرؓ حضرت خالدؓ کو اس وجہ سے معزول کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک شاعر کو ایک قصیدہ کے صلہ میں بہت سا روپیہ دے دیا تھا۔ آپ نے فرمایا، اگر خالدؓ نے اپنی جیب سے دیا تو اسراف کیا، اور اگر بیت المال سے دیا تو خیانت کی، اس لیے دونوں حالتوں میں معزول کیے جانے کے قابل ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی خلفاء کے لیے ایک ایسے نمونہ کا کام دیتی ہے کہ اس کے واقعات اس قابل ہیں کہ جگہ جگہ ان کا اعادہ کیا جائے۔ آپؓ کی محبوب بیوی ام کلثومؓ نے ایک دفعہ قیصر کے حرم کے پاس تحفہ کے طور پر عطر کی چند شیشیاں بھیجیں۔ اس نے اس کے جواب میں شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر بھیجا۔ حضرت عمرؓ کو یہ حال معلوم ہوا تو فرمایا گو عطر تمہارا تھا لیکن قاصد جو لے کر گیا تھا وہ سرکاری تھا، اور اس کے مصارف عام آمدنی میں سے ادا کیے گئے تھے۔ غرض وہ جواہرات لے کر بیت المال میں داخل کیے گیے اور انہیں کچھ معاوضہ دے دیا۔ ایک دفعہ آپ بیمار ہوئے۔ لوگوں نے علاج میں شہد تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن بلا اجازت نہیں لے سکتے تھے۔ مسجد نبوی میں جا کر لوگوں سے کہا، اگر آپ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا شہد لے لوں۔ اس

کارروائی سے مطلب اجازت کے سوا یہ ظاہر کرنا تھا کہ خزانۂ عامرہ پر خلیفۂ وقت کو اتنا اختیار بھی نہیں۔

اب فاروق اعظمؓ کے اس قسم کے طرزِ عمل کو بعد کے خلفاء کے طرزِ عمل کا مقابلہ کیا جائے جن کی شان و شوکت کے گیت فخریّہ طور سے گائے جاتے ہیں اور ان کے درباروں کا دبدبہ، قصروں کے شان اور تختوں کی شوکت زبان زدِ خلائق ہے۔ وہ مرشدِ خلفاء (فاروق اعظمؓ) اپنی زندگی اس طرز سے بسر کرے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کا خادم بنائے، اور یہ خلفاء لوگوں کو اپنا غلام جانیں اور ان کے روپے میں خیانت کر کے اس کو بیدریغ اپنی ذات پر خرچ کریں۔ حضرت عمرؓ کے ان واقعات سے شاید کوئی نادان یہ خیال کرے کہ اُنہیں حق تو حاصل تھا لیکن وہ جان بوجھ کر اس قسم کی زندگی بسر کرتے اور سادگی اور فقیرانہ طرز عمل مدِّ نظر رکھتے۔ یہ ہرگز نہیں۔ ان کا حق دُوسرے مسلمانوں کے برابر ہوا کرتا تھا۔ جو کچھ روزینہ یا مال دوسروں کو ملتا ان کو بھی اس تناسب سے حاصل ہوتا۔ کبھی کبھی اگر اتفاقیہ کوئی بڑی رقم آجایا کرتی تھی تو بیدریغ خرچ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ام کلثومؓ (بنت حضرت علیؓ و فاطمۃ الزہراؓ) سے نکاح ہوا تو ان کے شرف اور خاندان نبوت کے تعلق سے چالیس ہزار درہم مہر باندھا اور اُس وقت ادا بھی کر دیا۔ یہ اس لیے کہ اس وقت ان کے پاس یہ رقم آئی ہوئی تھی، انہوں نے بیت المال سے نہیں لیا تھا۔

اسلام کو زوال اس وقت آیا جبکہ خلفاء نے عدل و انصاف کو ہاتھ سے دے دیا۔ وہ قوانین اسلام پر کاربند نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے منگھڑت قانون بناتے تھے۔ خلیفہ چونکہ امیر المومنین ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ مسلمانوں میں انصاف برابر طور سے کرے اور اس معاملہ میں کسی کی رورعایت ملحوظ نہ رکھے، خواہ اس کا اپنا قرابت دار یا فرزند ہی ہو۔ اصل میں وہ مسلمانوں کا خادم ہے۔ یہ خدائے عزّوجل کی مہربانی ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اُسے یہ عزّت دی ہے کہ مسلمانوں کا امیر کر دیا ہے لیکن اس کے لیے یہ تو نہیں کہ امارت کے زعم میں وہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا کر ان سے ظلم روا رکھے۔ ہم خلفائے اسلام کے اکثر حالات سے معلوم کرتے ہیں کہ انہوں نے عدل و انصاف کو ہاتھ سے دے دیا اور اپنی مرضی کے مطابق جس طرح دل چاہا ان کے معاملات میں فیصلہ کرتے رہے۔ انہوں نے بے جا طور سے مسلمانوں کو قتل کیا، ان کے اموال چھین لیے اور انہیں تباہ کر دیا۔

اسلام نے دنیا میں جمہوریت کی بنیاد رکھی اور ہر ایک مسلمان کو حق دیا کہ آزادانہ طور سے سیاسی معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔ خلیفہ صرف مسلمانوں کا سردار ہے، اُسے کوئی حق نہیں کہ عامۃ الناس کے صلاح

ومشورہ کے بغیر کسی مہم کو انجام دے۔ ہمیں خلفائے راشدین کے واقعاتِ زندگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کبھی وہ کسی مہم کو انجام دینا چاہتے تو مجلس شوریٰ منعقد کر کے اس کے متعلق مناسب تجاویز بہم پہنچاتے۔ اس سے یہی مقصد ہوا کرتا کہ خلیفہ ہر ایک معاملہ میں مسلمانوں سے مشورہ لے۔ جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی طرف تشریف لے جانا چاہا تو آپ نے اس کے متعلق کل صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی رائے سے یہی قرار پایا کہ امیر المومنین تشریف لے جائیں۔ خلیفہ کسی معاملہ میں بھی امراء و وزراء سے خود مختار نہیں ہے۔ خود آنحضرتؐ کسی کام کو شروع کرتے تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کو جمع کر کے ان سے مناسب مشورہ لیتے جس سے یہ مدعا تھا کہ آیندہ کے لیے ایک مثال قائم ہو جائے جو کہ آنے والے خلفاء کے لیے رہنمائی کا کام دے۔ خلافت کا مقصد یہ نہیں کہ خلیفۂ وقت زر نگار تخت اور عالیشان محلاّت کا مالک ہو اور اس کی رعایا غلامی کا طوق گردن میں ڈالے ہوئے ہو۔ بلکہ خلافت تو اس لیے قائم کی گئی تھی کہ خدائے عزّوجل کے نام سے نظامِ دنیا قائم رکھا جائے اور چونکہ اللہ جل شانہ نے انسان کو ہی اس کا اہل خیال کیا اس لیے اسی کو اپنی نیابت کے لیے دنیا میں بھیجا۔

خلیفہ کے فرائض کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے صرف تھوڑے پر ہی قناعت کی جاتی ہے، اس لیے اس فصل کو حضرت عمرؓ کے ایک مختصر خطبہ کے الفاظ پر ختم کرتے ہیں جو کہ انہوں نے خلیفہ کے فرائض کے متعلق ایک دفعہ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا، ''مجھ کو تمہارے مال (یعنی بیت المال) میں اس قدر حق ہے جتنا یتیم کے مربّی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا، اور ضرورت پڑے گی تو دستور کے موافق کھانے کے لیے لوں گا۔ صاحبو! میرے اوپر تمہارے متعدد حقوق ہیں جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت بے جا طور سے نہ جمع کیا جائے۔ ایک یہ کہ جب میرے ہاتھ میں خراج اور غنیمت آئے تو بے جا طور سے صرف نہ ہونے پائے۔ ایک یہ کہ میں تمہارے روزینے بڑھاؤں اور سرحدوں کو محفوظ رکھوں۔ ایک یہ کہ تم کو خطرہ میں نہ ڈالوں۔''

# چودھویں فصل

## انحطاطِ اسلام

### اسباب

اگرچہ اسلام کی پیدائش کے بعد اسے بہت عروج ہوا۔ چین سے لے کر پرتگال تک تمام ملک اس کے قبضۂ اقتدار میں آ گئے۔ نہایت ہی جیّد اور سرکش شہنشاہوں کے اس نے سر جھکا دیئے اور خود اس کے شہنشاہ بھی ایسے ہیبت ناک ہوئے جن کے نام سے دنیا کانپتی تھی۔ لیکن حقیقتاً اس کو وہ عروج حاصل نہیں ہوا جو کہ خلفائے راشدین کے مبارک عہدوں میں اسے میسر تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہی سے اسے زوال کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ حقیقی تعلیم جو کہ دنیا میں یہ پھیلانا چاہتا تھا فوراً ہی بند ہو گئی۔ اپنی زندگی کے سوا تیرہ سو سال میں اس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے اور اس پر ایسی ایسی ضربیں لگیں جن سے اس کی یہ حالت ہو گئی جو کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں۔ مسلمان فی زمانہ نہایت شد و مد کے ساتھ اس کے تنزل کے مرثیہ گا رہے ہیں مگر کبھی بھی انہوں نے اس کے زوال کے اسباب کی طرف غور کر کے اس کی ترقی کے ذرائع نہیں سوچے۔ قاعدہ ہے کہ کسی چیز کے زوال اور کمال کے چند ایک وجوہات ہوتے ہیں اور اس لیے اسلام کی ترقی اور تنزل کے بھی اسباب موجود ہیں۔ ہمارا اس کتاب کے لکھنے سے صرف یہی مقصد تھا کہ اس میں خلافت کی ابتداء اور اس کی عہد بہ عہد کی ترقیات دکھلا کر اس کے زوال پر روشنی ڈالی جائے، لیکن چونکہ اسلام کا عروج و زوال بھی خلافت کے ساتھ ہی وابستہ ہے اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ انحطاطِ اسلام کے اسباب بھی قلم بند کر کے مسلمانوں کی اصلاح کے متعلق نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد چاروں خلفاء کا زمانہ نہایت ہی شاندار زمانہ تھا۔ اس میں اس کی تعلیم کماحقہ لوگوں کے دلنشین ہو گئی اور ان کے دلوں پر اس نے ایسا عمدہ اثر کیا کہ وہ خود و بخود اس کے گرویدہ ہو گئے۔ لیکن افسوس سے کہا جاتا ہے کہ خلیفۂ چہارم کے عہد میں اس میں تفرقہ اندازی شروع ہو گئی اور معاویہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے اس کے زوال کا بیج بویا۔ مسلمانوں نے کثرت رائے سے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کر کے اسلام کی گذشتہ روایات کو زندہ رکھنے کا ثبوت دیا لیکن معاویہ نے حضرت عثمانؓ کے قتل کے واقعہ کو بہانہ بنا کر

انتقام کی حجّت پیش کر کے حضرت علیؓ سے جو کہ خلیفۂ برحق تھے، خلافت کے چھیننے کی ایسی بے جا کوشش کی جو کہ اسلام کی آیندہ مصیبتوں اور تکلیفوں کا پیش خیمہ تھا۔ اس کے متعلق نہایت ہی وضاحت کے ساتھ گذشتہ فصلوں میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت امام حسنؑ کی شہادت کے بعد معاویہ نے جب خلافت کی باگ ہاتھ میں لی تو انہوں نے بالکل ہی اس کی جمہوریت کی شان کو ہاتھ سے دے دیا اور بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ خلفائے راشدین کے زمانوں میں لوگوں کو معاملات ملکی میں پورا پورا دخل تھا اور اب یہ ہوا کہ خلیفہ خود و بخود ہر ایک کام بلا مشورہ عامۃ المسلمین انجام دینے لگا۔ آپ نے اپنا رعب و داب اس قدر کہا کہ کسی شخص کو بولنے کی بھی جرأت نہیں ہوا کرتی تھی، اور اگر کوئی کام خلافِ شرع کرتے تو بھی ہر ایک کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلافت ذاتی ملکیّت بن گئی اور لوگ غلاموں کی طرح سلوک کیے جانے لگے۔ اس آزادی اور حریّت کی بنیاد جو کہ اسلام نے اپنی پیدایش کے ساتھ ہی رکھی تھی، جڑ سے اکھڑ کر غلامی اور بندگی میں تبدیل ہو گئی اور گویا اُس وقت سے ہی اسلام کے حیرت انگیز مشن کا خاتمہ ہو گیا، اور اس قدو سیع مملکتِ اسلام میں صرف ایک واحد شخص کا اختیار ہو گیا جو کہ جو کچھ بھی چاہتا اپنی مرضی کے مطابق کرتا، اور لوگوں کی وہ جرأت اور آزادی جو انہیں اموراتِ خلافت میں حاصل تھی یک قلم نیست و نابود ہو گئی۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایک شخص واحد کی رائے اس قدر صائب نہیں ہو سکتی جتنی کہ ایک جماعت کی ہو سکتی ہے اس لیے یہ نقص واقع ہوا کہ شخصی حکومت سے خلیفۂ وقت کی طبعیت پر خلافت کی ترقی اور تنزل کا انحصار ہوا کرتا۔ اگر خلیفہ فیّاض ہوتا تو لوگ اس کی سخاوت سے فائدہ اُٹھاتے اور غریب و مفلس مرفہ الحالی سے زندگی بسر کرتے۔ اگر وہ علم دوست ہوتا تو عالموں کی قدر ہوتی، اور جوق جوق علماء اور مشاہیر اس کے دربار میں جمع ہوتے اور اس کے حیرت انگیز انعام و اکرام سے بہرہ یاب ہو کر علمی ترقی میں چار چاند لگاتے۔ اگر بادشاہ شجاع و جرنیل ہوتا تو مہماتِ ملکی کی ترقی ہوتی، ہر طرف بہادری اور شجاعت کے ترانے گائے جاتے، اور نت نئے ملک قبضۂ اسلام میں آتے۔ اگر خلیفہ جابر و ظالم ہوتا تو رعایا مصائب و ابتلا میں مبتلا ہوتی، شہر ویران نظر آتے، مملکت میں بے رونقی رونما ہوتی، اور ہر طرف لوٹ اور غارت کا بازار گرم ہوتا۔ اور اگر بادشاہ سادہ مزاج، پاک باطن، مذہب کا پابند اور متشرع ہوتا تو سلطنت میں نیکی اور زہد کا چرچا ہوتا۔ غرضیکہ شخصی حکومت میں صرف ایک بات کا ہی رواج ہوتا جو کہ خلیفۂ وقت کی طبعیت پر منحصر ہوتا۔ اور یہ اس قسم کا نقص ہے کہ جمہوریت میں دیکھا نہیں جاتا اور اسی لیے شخصی حکومتیں کسی قوم و ملت کے لیے کسی صورت بھی ترقی کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ

ان کے سبب قومیں قعرِ مذلت میں گر جاتی ہیں۔ اسلام کے جس قدر بھی حکمران خاندان کی تاریخوں کا مطالعہ کیا جائے آپ یہی دیکھیں گے کہ کس قدر قلیل عرصہ میں وہ فنا ہو گئے، جس کا یہی سبب تھا کہ ان کی حکومتیں شخصی تھیں۔ اس لیے اسلام کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ اسکا جمہوریت سے شخصیت میں چلا جانا تھا۔ ظالم و جابر بادشاہوں نے اپنے احمقانہ افعال اور ستم زا طرز عمل سے لوگوں کو اپنا مخالف کر لیا اور پھر انہوں نے اس سے دامن چھڑانے کے لیے ایسی ایسی تجاویز نکالیں جن کے ذریعے اس کو فنا کرنے کے ساتھ ہی اسلام کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کے ظلم و ستم سے رہائی حاصل کرنے کے لیے غیر قوموں سے مدد لینی پڑتی تھی جو کہ اسلام کے جانی دشمن تھے اور جن کا مقصد یہی ہوا کرتا تھا کہ اسلام کو ضعف پہنچے۔ ہم بار بار کہتے آئے ہیں کہ اسلام سے جمہوریت کا رخصت ہونا گویا اسے ہمیشہ کے لیے بیوس کر دیا۔

اب چونکہ خلفاء خود مختارانہ حکومت کرنے لگے اور وسیع مملکتوں کے مالک بن گئے تو انہوں نے عیش و عشرت کو اپنا شیوہ بنالیا۔ بڑے بڑے قصر اور محل بنائے گئے، ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں، کنیزیں اور غلام ان کے اِرد گرد جمع ہو گئے، اور عیش و طرب میں اس قدر منہمک ہوئے کہ انہیں دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔ ان پر خدا کے سوا کوئی طاقت ور اور زبردست ہاتھ ہی نہیں تھا جس کا انہیں خوف ہوتا، اور خدا کو تو وہ ایک غائب چیز تصوّر کرتے تھے کیونکہ اس کے ہاں جوابدہ ہونے کے لیے ابھی وقت تھا۔ لوگوں کی آزادئ رائے کو انہوں نے اس قدر دبا دیا ہوا تھا کہ انہیں اظہار رائے کی جرأت ہی نہیں ہوا کرتی تھی، اور ان کی (خلفاء) اپنی یہ حالت تھی کہ محلات کی صحبتوں سے انہیں فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ خلافت کے کاروبار کی طرف متوجہ ہو سکیں جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک میں ابتری پھیلنی شروع ہو گئی اور سلطنت کے اہلکاروں نے گڑ بڑی مچانی شروع کر دی۔ جو کچھ جس کے ہاتھ میں آیا اڑا کر لے گیا، اپنی ملکیّت بنا بیٹھا کیونکہ خلفاء کو تو کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان کو شراب کے دور اور پری جمالوں کی صحبت سے فرصت ملتی تو وہ حالاتِ سلطنت کے متعلق آگاہی حاصل کرتے۔

آہستہ آہستہ خلفاء کی غفلت سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ غدّار اور حریص لوگوں کو مواقع ملے گئے کہ وہ اپنے ہاتھ رنگیں۔ چنانچہ مختلف قومیں بگڑ کھڑی ہوئیں اور خلفاء کی کمزوری ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ آج غوریوں نے زور پکڑا تو کل دیلمی طاقتور ہو گئے۔ اگر ایک طرف سلجیقیوں کی چیرہ دستی رونما ہوئی تو دوسری

طرف خاندان بویہ نے غلبہ حاصل کر لیا۔ کسی طرف عبیدیہ نے گڑبڑ مچادی، کسی طرف فاطمین دنیا کو غارت کرنے لگے۔ اسی میں فرقۂ باطینیہ دُنیا کی سٹیج پر آکودا جس نے اپنے شرمناک افعال سے دنیا کو مصائب میں مبتلا کیے رکھا۔ تیمور لنگ نے جس کو صاحبقران اعظم کے خطاب کے ساتھ دنیا کا مشہور مسلم فاتح کہا جاتا ہے۔ ایسا طوفان مچایا کہ خدا کی پناہ ہے۔ اس نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا، اور جہاں کہیں بھی گیا قتل و خون کا بازار گرم رکھا۔ اگر آج ایشیا کوچک میں ہے تو کل ایران میں۔ پھر ہندوستان میں زقند لگا رہا ہے۔ اسے رحم سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ اس کا حکم تھا کہ بلاامتیاز لوگوں کو قصابوں کی طرح ذبح کیا جائے۔ عورتوں کی پردہ دری ہو، شہروں کو جلا کر خاک سیاہ کیا جائے، اور غارت گری کو کام میں لایا جائے۔ اسلام کی اگر کچھ رہی سہی طاقت باقی بھی تھی تو اس نے اُسے جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ غرضیکہ عجیب قسم کی طوایف الملوکی ہو گئی۔ جس کا جی چاہا آکُودا، اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کر کے اپنا فائدہ اٹھایا۔ خلیفہ بچارا کیا رہ گیا تھا، موم کی ناک۔ اس کا کوئی اقتدار ہی نہیں تھا۔ اس کی حکومت بغداد کی چار دیواری کے اندر تھی لیکن وہ بھی محدود۔ کبھی وہ بویہ الدیلمی، کبھی حمدانی اور کبھی سلجوقی شاہان کے قبضہ میں تھا۔ جو کچھ ان کا جی چاہتا اس سے کرواتے۔

افسوس یہ سب کچھ خلفاء کی اپنی کمزوریوں سے پیش آیا اور ان کے عیش و عشرت نے اسلام کو ایسا روزِ بد دکھلایا۔ اگر وہ اسلام کی زرّیں تعلیم کے مطابق خلافت کے کاروبار انجام دیتے تو کسی کو کیا جرأت تھی کہ سر اُٹھاتا۔ اسلام میں بربادی اور تباہی جس کا اب تک اس کو سامنا ہے انہیں خلفاء کے نالائق اور ناشائستہ چال چلن کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ہم بزور کہیں گے کہ جس قدر لغویات اور بیہودہ باتیں مسلمانوں میں اس وقت دیکھنے میں آرہی ہیں وہ انہیں عیش پرست خلفاء کی طفیل سے ہیں۔ اگر وہ ہوشیار ہوتے، اپنے فرائض کو سمجھتے، اور ان کے انجام دینے میں مستعد رہتے تو دنیائے اسلام کا مرکز کبھی بھی نہ ہلتا، اور تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی مرکز پر مجتمع رہتے۔ اور وہ حریص لوگ جنہوں نے ہوا و حرص سے سلطنتیں قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگے کبھی بھی ایسی دیدہ دلیری نہ کرتے۔ بنی عباس کے آخری دور میں دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر ایک شہر خود مختار ہوا ہوا تھا۔ چپہ چپہ پر ترکوں اور تاتاریوں کا غلبہ تھا۔ انہوں نے اپنی خود مختارانہ حکومتیں قائم کی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے سے لڑ کر خود بھی فنا ہوتے تھے اور اسلام کی طاقت کو بھی زائل کرتے تھے۔ جب لوگ اسلامی شہنشاہوں کی تعریف میں بڑے بڑے لمبے قصائد گاتے ہیں، اور خوشامدی مؤرخین ان بادشاہوں کی شان میں تواریخ کے اوراق سیاہ کرتے ہیں تو پڑھ کر طبعیت پریشان ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ ان فاتحانِ

اسلام نے کیا وہ اسلام کی تعلیم کے بالکل منافی تھا۔ اسلام نے تو یہ تعلیم دی تھی کہ تم ایک ہی مرکز پر رہو، تمہارا ایک ہی خلیفہ ہوگا۔ تمام دنیائے اسلام اس کے ماتحت ہوگی اور وہی تمہارے دینی اور دنیوی امورات کا کفیل ہوگا۔ پھر دُوسروں کو کیا حق تھا بڑی بڑی فتوحات کریں اور اسلام کی جمہوریت کی شان کو غارت کر کے شخصی حکومتیں قائم کریں۔ ان غاصب بادشاہوں میں جو ذرا زیادہ چالاک تھے وہ ایک عجیب قسم کے مکر سے کام لیتے تھے۔ وہ خلیفۂ بغداد کو خلیفہ مانتے اور اس کے نام سے ظاہر طور سے فتوحات کا سلسلہ قائم رکھتے اور خطبہ میں بھی برائے نام اس کا نام لے چھوڑتے۔ ورنہ اصل میں وہ خود ہی جو کچھ چاہتے کرتے، اس بچارے کا نام تو صرف ایک بہانہ ہی ہوا کرتا۔

قطع نظر اس کے اسلام کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب (خلفاء کے عیش و عشرت کے بعد) اس پاک مذہب میں فرقہ بندی ہے۔ یوں تو اس وقت ہزارہا فرقے اس میں دیکھنے میں آرہے ہیں لیکن جس قدر سب سے بڑے گروہ شیعہ و سُنی نے اُسے نقصان پہنچایا شاید کسی اور نے پہنچایا ہو کیونکہ دیگر فرقے ان دونوں کی شاخیں ہی ہیں۔ ان دونوں کے نفاق نے ایک دوسرے کو اس قدر بیگانہ کر دیا ہے کہ ان کا تمدّن، ان کی مذہبی رسومات، ان کی عبادت، ان کی روایات غرضیکہ ان کی ہر ایک بات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا جانے آہستہ آہستہ ان میں اس قدر تفریق کس طرح واقع ہوگئی، ورنہ ایک ہی خدا کے ماننے والے، ایک ہی کعبہ کے طواف کرنے والے، ایک ہی قرآن مجید پر ایمان رکھنے والے (اگرچہ شیعہ کہتے ہیں کہ سُنیوں کا قرآن مجید غلط ہے) اور ایک ہی رسولؐ کی اطاعت کرنے والے ہیں، ان میں ضد اور ہٹ اس قدر زوروں پر ہے کہ ایک دوسرے کو بُرا کہنا کے ساتھ بزرگانِ اسلام کی شان میں ایسی ایسی بیہودہ باتیں کہتے ہیں جن کے سننے سے طبعیت از حد پریشان ہوتی ہے۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کی بنیاد قائم ہونے کے متعلق بہت کچھ چھان بین کی ہے اور کوشش کی کہ یہ معلوم ہو کہ آخر یہ کہاں سے شروع ہوئے اور ان کی ہستی کہاں سے قائم ہوئی، لیکن کہیں سے بھی پورے طور سے اس کے متعلق حالات معلوم نہیں ہوئے۔ صرف مختلف کتب کے مطالعہ سے اس قدر واقفیت حاصل ہوئی ہے کہ ان میں ہٹ اور ضد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ذیل میں ان دونوں گروہوں کی تاریخ پر کسی قدر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ شاید کہ ناظرین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہو۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے اُمّت میں کسی قدر اختلاف ہوا اور انصار نے اپنے میں

سے کسی کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی لیکن آخر کار کثرت رائے سے حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ اسلام بنائے گئے۔ حضرت علیؓ کو یہ خیال تھا کہ خلافت کا حق میرا ہے اس لیے آپ کو اس بات کا رنج رہا۔ لیکن جب تھوڑے سے عرصہ کے بعد آپ کے روشن دل پر حقیقت کا انکشاف ہو گیا تو آپ نے ایک روز حضرت ابو بکر صدیقؓ کو کسی کے ہاتھ اپنے دولت کدہ پر بُلوا بھیجا تا کہ آپ ان سے بیعت کر لیں۔ چنانچہ خلیفۂ اول آپ کے دولت خانہ پر تشریف لے گئے اور حضرت علیؓ نے نہایت ہی خوشی کے ساتھ آپ سے بیعت کر لی (طبریؒ)۔ اس کے بعد حضرت علیؓ ہمیشہ خلیفۂ اول و خلیفۂ ثانی کے دست و باز و ہو گئے اور ہر ایک معاملہ میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ جب کبھی کوئی اہم مہم درپیش ہوتی تو شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) آپ سے ضروری مشورہ لیتے اور آپ کی ہی رائے پر عملدر آمد کیا جاتا۔ چونکہ آپ نے بھی دیگر صحابہؓ کی طرح شیخین کی بیعت باری باری کر لی ہوئی تھی اس لیے ان کی طرح آپ بھی اُنہیں خلیفہ مانتے تھے اور ان کے احکام کی اسی طرح پابندی کرتے جس طرح کہ دوسرے لوگ کیا کرتے تھے۔ چونکہ خلیفہ کا سب سے بڑا فرض امامت ہے اس لیے ان کے پیچھے نماز ادا کرتے، زکواۃ دیتے، اور دوسری مذہبی رسومات ادا کرتے۔ لوگوں نے بعد کے زمانہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے تعلقات میں عجیب طرح کی تاویلیں کی ہیں۔ ان کو ایک دوسرے کا دشمن قرار دیا لیکن نہایت ہی مستند مورخین کی سند سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی دختر حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا تھا اور اس رشتہ سے آپ نے اپنے نہایت ہی گہرے تعلق کا ثبوت دیا (طبریؒ)۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ امن میں یہی پتا چلتا ہے کہ مسلمان نہایت ہی فارغبالی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی قسم کا تنازعہ ان میں نہیں پایا جاتا تھا اور خاندانِ نبوّت کے ساتھ خلفاء کا سلوک نہایت ہی اچھا ہوا کرتا تھا۔ ہر ایک بات میں ان کی عزت و توقیر کرتے اور اس خاندان کی خدمت اپنے لیے سعادتِ دارین تصوّر کرتے۔ غنیمت کا مال آتا تو سب سے مقدم اہلبیت کو رکھتے۔

جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو چند شورہ پشت لوگوں کے سبب سے لوگوں میں کسی قدر اختلاف ہو گیا۔ چند لوگ جن کو گمان ہو گیا تھا کہ ان سے ظلم ہو رہا ہے، خلیفہ عثمانؓ سے باغی ہو گئے اور آخر کار خلیفۂ ثالث شہید کیے گئے۔ تاریخ شاید ہے کہ حضرت علیؓ نے اس بغاوت کے فرو کرنے میں نہایت ہی جد وجہد کی اور ہر طرح سے کوشاں رہے کہ باغی لوگ واپس چلے جائیں لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ آپ کو شہادت کا درجہ حاصل ہو۔ اب حضرت عثمانؓ کی شہادت سے خود غرض اور حریص لوگوں کو موقع مل گیا کہ اپنا اُلّو سیدھا کریں۔ چنانچہ معاویہ

نے جو کہ بنی اُمیّہ میں سے ہونے کے سبب حضرت عثمانؓ کے قرابت دار تھے حضرت علیؓ پر یہ الزام لگایا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں آپ کا ہاتھ تھا، اور لوگوں کو برانگیختہ کیا کہ خلیفہ چہارم سے انتقام لیا جائے۔ معاویہ کا اقتدار اور رسوخ شام میں بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے جھوٹی سچی باتوں سے لوگوں کو حضرت علیؓ کے خلاف کر دیا اور چند اور خود غرض ہستیوں کو ساتھ ملا کر آنحضرتؐ کے خاص حرم (عائشہ صدیقہؓ) کو آپ کے خلاف کر کے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ آپ کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا، اور نہایت خونریز معرکہ ہوئے جن میں حضرت علیؓ کو کامیابی ہوتی رہی۔ ان معرکوں کے حالات گذشتہ اوراق میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان معرکوں میں چونکہ اہل اسلام کے دو گروہ ہوئے ہوئے تھے، ایک حضرت علیؓ کا طرف دار اور دوسرا معاویہ کا حامی تھا، اس لیے وہ پہلا موقعہ تھا کہ اسلام میں تفرقہ کی صورت واقع ہوئی۔ جو لوگ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے وہ ''شیعانِ علیؓ'' کہلاتے تھے۔ شیعہ کے لغوی معنی ہیں ''گروہ''، یعنی حضرت علیؓ کا گروہ''، لیکن تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ معاویہ کے طرف داروں کو بھی کسی نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ البتہ اگر کسی نام سے پکارا بھی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ باغی ''گروہ'' تھا کیونکہ علانیہ طور سے وہ خلیفۂ وقت کے خلاف بغاوت کر رہا تھا اور حضرت علیؓ کے سخت مخالف تھا۔ اور اس لیے ضرور ہے کہ آپ کی شان میں بُرے کلمات استعمال کرتا ہوگا جیسا کہ بعد میں ثابت ہوتا ہے کہ معاویہ حضرت علیؓ کو خطبوں میں تبرّا بھیجا کرتے تھے۔

اس کے بعد جب حضرت علیؓ کی شہادت واقع ہوئی تو لوگوں نے حضرت امام حسنؑ کو خلیفہ منتخب کیا لیکن آپ نے اپنے حیرت انگیز زہد و تقویٰ کے باعث خلافت کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ معاویہ کو کیا چاہیے تھا، اب انہوں نے دنیائے اسلام پر قبضہ کر لیا اور وہ لوگ بھی جو کہ ''شیعانِ علیؓ'' کہلاتے تھے ان کے دست و بازو بن گئے۔ معاویہ کی وفات کے بعد ان کا ناہنجار اور سیہ کار فرزند یزید تخت نشین ہوا۔ حضرت امام حسینؑ نے صرف اس لیے اس کی بیعت نہ کی کہ وہ پابند شریعت نہ تھا اور بلا کسی قسم کی تحریک کے مدینہ منورہ میں اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ حضرت علیؓ نے جنگ صفین کے بعد مدینہ منورہ کی جگہ کوفہ دار الخلافہ بنا لیا تھا کیونکہ وہاں کے لوگ آپ کے حامی اور مددگار تھے۔ جب ان لوگوں نے سُنا کہ حضرت امام حسینؑ یزید کی بیعت سے انکاری ہیں تو انہوں نے آپ کو خطوط لکھ کر کوفہ بلا بھیجا اور استدعا کی کہ آپ وہاں تشریف لائیں تاکہ ہم لوگ آپ سے بیعت کریں کیونکہ آپ ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ حضرت امام علیہ السلام اس دعوت پر راضی ہو گئے اور معہ عیال و اطفال کوفہ کی طرف تشریف لے گئے لیکن ان لوگوں نے آپ سے غدّاری کی، اور آپ کی

حمایت کا دم بھرتے بھرتے آپ کے مخالف ہو کر یزیدی فوج کے ساتھ مل کر آپ کو شہید کروا ڈالا۔ غور کا مقام ہے کہ وہی ''شیعانِ علیؓ'' اہلبیت کا ساتھ چھوڑ گئے اور حضرت علیؓ کے فرزند ارجمند و نواسہ سرورِ کائناتؐ کو کس بے رحمی کے ساتھ مروایا۔ پہلے تو اسلام میں دو گروہ تھے، ایک ''باغی گروہ'' اور دوسرا ''شیعانِ علیؓ''، اب دونوں مل کر ایک ہی گروہ بن گیا اور خاص اہلبیت کا جانی دشمن ہو گیا۔

اس کے علاوہ ایک اور بھی گروہ تھا جو کہ بالکل الگ تھا۔ اس کو نہ تو یزیدیوں سے سروکار تھا اور نہ ہی سرگرمی کے ساتھ حضرت امامؑ کا ساتھ دیتا تھا، اگرچہ اس نے انہیں بہت کچھ روکا تھا کہ آپ کوفہ نہ تشریف لے جائیں۔ لیکن چونکہ آپ کی طبعیت اس بات پر جمی ہوئی تھی کہ وہ لوگ آپ کے حامی ہیں اور کسی طرح بھی آپ سے غداری نہ کریں گے اس لیے آپ نے توجہ نہ فرمائی اور وہاں چلے ہی گئے۔ یہ گروہ صحابہؓ کا تھا اور دل سے یزید کو بہت ہی بُرا جانتا تھا۔ اس میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جیسے متقی اور پرہیزگار لوگ تھے۔ انہوں نے معاویہ کے خلاف حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا اور حضرت علیؓ کو حق پر جانتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بصرہ کے گورنر رہے تھے اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ہمدردی کا یہاں تک ثبوت ملتا ہے کہ جب جنگِ صفین واقعہ ہوئی تو معاویہ ایک سرکش اونٹ پر سوار تھے اور بلند آواز سے پکار رہے تھے، آج میرا مدِّ مقابل کون ہے اور میرے مقابلہ پر خلافت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ میں کہوں، آج وہ لوگ تیرے مقابلہ پر خلافت کا دعویٰ کرتے ہیں جنہوں نے تجھے اور تیرے باپ کو مار مار کر مسلمان کیا، لیکن تکبّر کے خیال سے میں باز رہا۔ اس سے آپ کا فتحِ مکّہ کی طرف اشارہ تھا۔ اس فتح میں حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بھی شامل تھے اور اس کے بعد معاویہ اور ان کے والد ابو سفیان مسلمان ہوئے تھے۔ خیال کیجیے، یہ لوگ حضرت علیؓ سے کس قدر ہمدردی رکھتے اور معاویہ اور ان کے جانشینوں سے کس قدر متنفر تھے۔ وہی لوگ جو کہ حضرت علیؓ کے سرگرم حامی تھے، آپ کے فرزند کے کس قدر دشمن ہو گئے اور انہوں نے ہی اپنے ہاتھ سے اس مظلوم نبیرۂ رسولؐ کو کربلا کے میدان میں شہید کیا۔ خود کتبِ شیعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت امامؑ کے خاندان اور چند لوگوں کے سوائے آپ کا کوئی بھی یار و مددگار نہیں تھا۔ ہم اپنے برادرانِ شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت وہ لوگ جو کہ معاویہ کے خلاف حضرت علیؓ کا ساتھ دیتے رہے تھے اور ''شیعانِ علیؓ'' کہلاتے تھے، کیا ہوئے اور کیوں انہوں نے امام مظلوم کو شہید ہوتے دیکھا اور چون وچرا نہ کیا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ

غدّار ہو گئے اور اہلبیت کا ساتھ ترک کر گئے۔ جس گروہ کو شیعہ برادران بُرا بھلا کہتے ہیں وہ انہیں صحابہؓ کا تھا جو اس فتنہ سے کنارہ کش رہے اور یزید کے کارناموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آپ نے یہاں تک تو دیکھ لیا کہ کس طرح ''شیعانِ علیؓ'' نے آپ کے خاندان کے دشمن ہو کر سرورِ کائناتؐ کی اولاد کی گردنوں پر چُھریاں چلائیں، اور وہ لوگ جو معاویہ کے خلاف حضرت علیؓ کا ساتھ دیتے تھے امامؑ کے زبردستی کوفہ تشریف لے جانے سے الگ رہے اور معاویہ کے جانشین کے افعال کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اب آگے سُنیے۔ جب اہل کوفہ حضرت امامؑ کو شہید کر چکے، آپ کے اہل خانہ کی بے حرمتی کر چکے، یتیموں کو فنا کر چکے، خاندان نبوت کی توہین کر چکے، تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ہم نے کیا کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر کہا، ''ہم سے بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ پہلے تو ہم نے حضرت امام حسینؑ نواسۂ رسول اللہؐ کو دعوت دی اور بلایا اور پھر ان کا ساتھ چھوڑ کر انہیں بے کسی میں شہید ہونے دیا۔'' اس اجماع کے بعد ان لوگوں نے کہا کہ پہلے ہم کو حضرت امامؑ کے مزار پر چلنا چاہیے تاکہ ان کی زیارت بھی کریں اور ان کی روح سے اپنے سابقہ گناہوں کی معافی بھی چاہیں۔ چنانچہ دس ہزار کا جمِ غفیر سر برہنہ ہو کر مزار مبارک پر حاضر ہوا اور مزار کو دیکھ کر ایسا چیخیں مار مار کر رویا کہ کوسوں تک میدان گونج اٹھا۔ اس کے بعد عہد کیا کہ قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لیا جائے گا اور اپنی جانیں تک قربان کی جائیں گی۔

اب انہوں نے نبیرۂ رسولِ اکرمؐ کی حمایت میں اس قدر سرگرمی دکھلائی کہ اسی جوش میں انہوں نے گذشتہ باتوں کو بھی زندہ کر دیا اور مسئلہ خلافت کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ''رافضی'' کا لقب اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ خلافت کا حق تو حضرت علیؓ کا تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت علیؓ سے ظلم و جبر کیا اور انہیں خلافت سے محروم کر کے خود غصب کر لیا۔ اسی سرگرمی میں وہ ایسے ایسے کلمات مُنہ سے نکالنے لگے کہ توبہ نعوذ باللہ بالکل ناروا تھے۔

جیسا کہ پیشتر بھی ذکر کیا گیا ہے، وہ لوگ جو کہ ''شیعانِ علیؓ'' میں سے تھے اور ''غدّار گروہ'' کے خلاف ہتھیار بند ہوتے تھے لیکن حضرت امام حسینؑ کے کوفہ تشریف لے جانے کے بعد پیچھے رہ کر فتنہ و فساد سے الگ رہے تھے، جب انہوں نے ان لوگوں کے ایسے طرزِ عمل کو دیکھا کہ خلفائے راشدین (ابو بکر، عمر و عثمانؓ) کی شان میں ایسے ایسے لغو کلمات کہتے ہیں تو وہ ان سے معترض ہوئے۔ لیکن تائب گروہ کی محبت اب اس قدر حد سے بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی کو بھی زعم میں نہیں لاتا تھا اور اہلبیت کی محبّت میں ایسا سرشار تھا کہ جائز و ناجائز

بات میں فرق نہیں معلوم کر سکتا تھا۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی کہ ایک طرف تو وہ لوگ ہو گئے جو کہ حضرت امام حسینؑ کے قتل میں حصّہ دار تھے لیکن تائب ہو کر پھر ''شیعہ'' کے لقب سے سر گرم حامی ہو گئے اور اسی حمایت میں حضرات شیخینؓ کو تبرّا بھیجنے لگے، اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا ، یزید سے متنفر رہے، لیکن حضرات شیخینؓ کو بُرا کہنے میں معترض تھے۔ انہیں سُنّی کا لقب دیا گیا۔

اب دیکھنا ہے کہ شیعہ حقیقت میں خاندانِ نبوت کے ہواخواہ تھے یا کہ سُنّی۔ ایک سمجھدار انسان فوراً کہے گا کہ سنی ہی وہ لوگ ہیں جو سرور کائنات کے دلدادہ، ان کے خلفاء کے جان نثار، اہلبیت کے حامی ہیں۔ انہوں نے اسلام کی پیدائش سے لے کر اب تک اس کا ساتھ دیا لیکن وہ لوگ جو شیعہ کہلاتے ہیں اور حضرت امام حسینؑ اور خاندانِ نبوت کے حامی اور ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہی ہیں جنہوں نے پہلے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا، پھر آپ کی اولاد کو آنکھوں کے سامنے کٹوایا، اور تائب ہو کر خاندانِ نبوت کے حامی اور مددگار ہو گئے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو آج کل سنّی کہا جاتا ہے وہی حقیقی معنوں میں شیعہ ہیں کیونکہ وہی لوگ شروع سے لے کر اب تک خاندانِ نبوّت کے حامی اور یزید سے متنفر رہے ہیں۔ انہوں نے نہ کبھی علیؓ کا ساتھ چھوڑا اور نہ پھر تائب ہو کر آپ کی حمایت میں اس قدر سر گرمی دکھلائی کہ آنحضرتؐ کے محبوب دوستوں اور حضرت علیؓ کے نہایت ہی برگزیدہ یاروں کو بُرا بھلا کہا بلکہ ان سب کو ایک ہی آنکھ دیکھا۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہو سکا ان دونوں گروہوں کی تاریخ لکھ دی ہے۔ اب ہم سنیوں اور برادرانِ شیعہ پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ آیا کہاں تک یہ صحت پر مبنی ہے اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو وہ ہمیں بتلادیں۔ ہمیں تو اس کے سوا کچھ اور معلوم ہی نہیں ہوتا۔

اصل واقعات یہ ہیں، لیکن بات کا بتنگڑ بنایا گیا ہے اور ان دونوں گروہوں کے جھگڑوں نے اسلام کو اس قدر ضعیف کیا ہے کہ اسے ہوش تک نہیں آتا کیا اچھا ہوا گر ان دونوں گروہوں کے بڑے بڑے علماء عقل سے کام لے کر متنازعہ فیہ مسئلوں پر ہر ایک پہلو سے غور کر کے آئے دن کے جھگڑوں کا ایک دفعہ تصفیہ کر لیں۔ حضرات شیعہ کا یہی دعویٰ ہے کہ ہم خاندان نبوّت کے حامی و مددگار ہیں اور حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر غم کے آنسو بہا کر یزید کو نفریں بھیجتے ہیں۔ ہمارا ان سے سوال ہے، کیا سنّی ایسا نہیں کرتے؟ سنّیوں میں سے ایک فردِ واحد بھی بتلادیا جائے جو کہ یزید کو حق پر جانتا ہو۔ وہ تو حضراتِ شیعہ سے زیادہ اس کی جان کے دشمن ہیں، پھر جھگڑے کی بنیاد کیا ہے۔ ہاں البتہ سنی یہی چاہتے ہیں کہ خلفائے راشدین کو بُرا نہ کہا جائے کیونکہ یزید کے اور ان

کے کچھ تعلقات ہی نہیں ہو سکتے۔ اگر دونوں زبردست گروہ ٹھنڈے دل سے ان معاملات پر غور کریں تو شاید کہ اسلام کی ترقی اور عروج کی کوئی صورت نکل آئے۔

شیعہ سنّی کے جھگڑوں نے تو خیر جو کچھ نقصان پہنچایا وہ تو پہنچایا ہی ہے، لیکن ہزاروں فرقے گروہ سنّی میں موجود ہیں جن سے اسلام کی رہی سہی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ جب آنحضرتؐ زندہ تھے تو صحابہؓ کو جو کچھ مسئلہ پوچھنا ہوتا آپ سے پوچھ لیتے، اس لیے دینی مسائل میں کسی قسم کا اختلاف واقع نہیں ہوا تھا۔ آپ کے بعد بھی صحابہؓ میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا اس لیے کہ انہوں نے سرور کائناتؐ کی صحبت کا فیض حاصل کیا تھا اور ان کے دلوں پر آپ کی تعلیم کا نقش تازہ تھا۔ ان لوگوں کے بعد جب فتوحاتِ اسلامی وسیع ہو گئیں اور ضروریات بڑھ گئیں تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قوانین اسلام کو مرتب کیا جائے تاکہ آیندہ نسلوں کو اس میں سہولت ہو۔ چونکہ ہر ایک بات قرآن مجید و احادیث مقدس میں بہ تشریح موجود نہیں تھی اور ہر ایک مسئلہ تصریحاً اُس مجموعہ قوانین اسلام میں نہیں دیا ہوا تھا اس لیے علمائے دین کو اس امر کا خیال ہوا کہ ہر ایک مسئلہ میں اجتہاد سے کام لے کر اس کے متعلق استدلالاً روشنی ڈالی جائے۔ چنانچہ فقہ ایجاد کیا گیا جو کہ قانونِ اسلام کا ایک جزو لاینفک ہو گیا اور جس نے اس قانون کو نہایت ہی تقویت دی۔ اس کے ذریعہ عقلاً و قیاساً اُن مسائل کو حل کیا گیا جو کہ تصریحاً قرآن و حدیث میں نہیں ملتے تھے۔ اس کے چار شہرۂ آفاق امام ہوئے ہیں جنہیں آئمہ اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے نامِ نامی یہ ہیں: امام اعظمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد حنبلؒ۔ انہوں نے اپنے اپنے قیاس کے مطابق اور قرآن و حدیث کے حوالہ سے نہایت ہی تحقیق اور تدقیق کے ساتھ ہر ایک مشکل مسئلہ کو حل کیا۔ ان لوگوں کے اسلام پر بڑے بڑے احسان ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیاں خدمتِ اسلام کے لیے وقف کر کے آیندہ نسلوں کی تکلیفوں کو رفع کرنے کے لیے ایک ایسا مجموعہ قوانین چھوڑا جو کہ نہایت ہی مفید ہے۔ لیکن رنج و افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے اس کا کچھ کا کچھ مطلب لے کر اس میں رخنہ اندازیاں شروع کر دیں اور ایسے علیحدہ علیحدہ مذہبوں کی صورت دے دی جس سے دنیائے اسلام (علاوہ شیعہ کے) چار بڑے بڑے حلقوں میں تقسیم ہو گئی۔ جو لوگ حضرت امام اعظمؒ کے ترتیب کردہ اصولوں کی پیروی کرنے لگے وہ حنفی بن گئے، جو امام مالکؒ کی پیرو ہوئے وہ مالکی بن گئے، اور علےٰ ہذاالقیاس، شافعی اور حنبلی بن گئے۔ چنانچہ ان چاروں گروہوں کے جھگڑے اور قضیئے اس قدر بڑھ گئے کہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ خلفائے بنی عباس کے آخری دور میں ان فرقوں کے تنازعوں نے اس قدر زور پکڑا تھا کہ

تلوار تک کی نوبت پہنچ رہی تھی اور وہ وہ فتنہ و فساد برپا ہوتے رہے کہ خدا کی پناہ ہے۔ ان بزرگوں نے تو اسلام پر احسان کیا اور مسلمانوں کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ تفرقہ پردازی کی بنیاد پڑ گئی۔ انہوں نے اعلانیہ طور سے اپنی کتب میں اس بات کا اظہار کیا کہ ہمارا علم صرف قیاس پر مبنی ہے، اگر ہمارا کوئی مسئلہ قرآن و حدیث سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اسے باطل کر دو۔ لیکن لوگوں نے ہٹ اور ضد کے سبب اس بات کی طرف غور نہ کیا اور جو کچھ وہ کہہ گئے اسے پتھر کی لکیر سمجھنے لگے اور اپنے امام کی حمایت میں صف بستہ ہو کر ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے لگے۔ خلیفہ معتصم آخری خلیفہ عباس کے عہد میں خاص خاص دارالسلطنت بغداد میں حنبلیوں کا بڑا زور تھا۔ انہیں شافعیوں سے اس قدر بغض و عناد تھا کہ ہر وقت ان پر ہلّہ کر کے انہیں تباہ کرنے کی تجاویز سوچتے رہتے تھے اور ہمیشہ ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت خونریزی کی نوبت آتی رہتی تھی۔ آخر ان لوگوں سے کوئی پوچھنے والا ہوتا تو پوچھتا کہ خدا کے بندو! تم خواہ مخواہ ایک دوسرے کے سر کس لیے ہو رہے ہو۔ اگر تم میں اجتہادی اختلاف ہے تو ہونے دو، آخر ایک کی عقل دوسرے کی عقل سے نہیں مل سکتی ہے۔ ہر ایک امام نے اپنی اپنی عقل اور قیاس سے کام لیا ہے۔ تم یوں ہی دست و گریبان ہو رہے ہو، تمہارا مذہب تو ایک ہی ہے۔ آنحضرتؐ نے تمہارے لیے مختلف فرقوں کی بنیاد تو نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے تمہیں اخوت کی ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا ہوا تھا، پھر تم اسے کس لیے توڑنے کے درپے ہوئے ہوئے ہو۔

افسوس مسلمانوں نے اپنی تباہی کے سامان خود اپنے ہاتھوں کیے۔ اس زمانہ میں تو خیر جو کچھ فرقہ بندی تھی، سو تھی لیکن فی زمانہ اسے بہت زیادہ ترقی ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کی مسجدیں الگ ہو گئی ہیں، طریقۂ عبادت الگ بن گیا ہے، اور ایک دوسرے کو آزادانہ طور سے کفر کے فتوے دے رہے ہیں اور اس قدر دنگہ و فساد مچا ہوا ہے کہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ جیسا کہ ان لوگوں (ائمہ اربعہ) نے اپنے قیاس و استدلال سے تمہارے لیے کسی مسئلہ کو آسان کیا ہے، اگر تم اسے قرآن و حدیث کے منافی خیال کرتے ہو ویسی ہی خدا نے تمہیں عقل دی ہے، تم خود اس پر غور کرو اور اگر اس پر شک کرتے ہو تو اسے ترک کر دو۔ ان اماموں کے بنائے ہوئے مسئلے تمہارے لیے قرآن و حدیث کا حکم نہیں رکھتے ہیں۔ سچ ہے، اس فرقہ بندی نے اسلام کو جس قدر ضعف پہنچایا ہے اور کسی نے نہیں پہنچایا۔ آخر تم کس لیے ایک الگ نام اپنے لیے مقرر کرتے ہو۔ کوئی کہتا ہے حنفی ہوں، کوئی کہتا ہے شافعی ہوں۔ اس سے کیا مطلب۔ تم سب مسلمان ہو، ایک ہی خدا، ایک ہی قرآن، ایک ہی رسول اور ایک ہی کعبہ ہے، پھر ان فروعات میں پڑ کر کیوں اسلام کی بربادی کے درپے ہو گئے ہو۔ تمہارے

اس قسم کے طرز عمل نے اسلام کی یہاں تک نوبت پہنچائی ہے۔ اگر ایک شخص کسی خاص امام کی پیروی کرتا ہے تو وہ دوسرے امام کے پیرو کے نکتۂ خیال کے مطابق کافر نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ امام کی پیروی فرضیت میں داخل نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی عقل سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ان کی کتب قرآن و حدیث کی تشریح کے متعلق ہیں اور جس طرح قانونی کتب کی شرحیں لکھی جاتی ہیں اسی طرح قانون اسلام کی یہ شرحیں ہیں۔ قانونِ انگریزی جو کہ ہندوستان میں رائج ہے اس پر ہزاروں شرحیں لکھی گئی ہیں اور ایک شارح دوسرے سے بہت سی باتوں میں اختلاف رکھتا ہے۔ اگر یہ حال ہے تو تمہارے خیال کے مطابق یہاں بھی دنگہ و فساد ہونا چاہیے۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ ان اماموں کی پیروی ہمارے لیے فرضیت میں داخل نہیں ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی بنے رہو لیکن ایک دوسرے کو بُرا مت کہو۔ ہٹ اور ضد کو ترک کر دو۔ تمہارے اس طرح کے الگ الگ گروہ میں منقسم ہونے سے یہ مطلب ہے کہ تم فلاں فلاں امام کے اصولوں کی پیروی کرتے ہو اور جو کوئی تم سے اختلاف رکھتا ہے وہ دین سے خارج ہے۔ ایسا ہر گز نہیں۔ تم قرآن و حدیث کی پیروی کرو کیونکہ انہوں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار قرآن و حدیث سے ہی کیا ہے۔ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرو۔ حضرت امام اعظمؒ، حضرت امام مالکؒ سے تیرہ سال بڑے تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں وہ خود امام مالکؒ کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جب آپ تشریف لاتے تو امام مالکؒ نہایت ہی ادب سے بیٹھ جایا کرتے۔ ایک دن ایک شاگرد نے آپ سے پوچھا، حضور یہ کون بزرگ ہیں جن کا آپ کو اس قدر پاس ادب ہے۔ آپ نے فرمایا، یہ امام ابو حنیفہؒ ہیں جو اپنے استدلال سے پتھر کو سونا ثابت کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ایک دوسرے پر کس قدر حسن ظن تھا اور ایک دوسرے کو کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ امام شافعیؒ امام مالکؒ کے تلامذہ میں داخل تھے اور ہر وقت دوزانو کمربستہ ان کی خدمت میں رہتے تھے۔ امام احمد حنبلؒ امام شافعیؒ کے شاگرد تھے اور ان کی خدمت سعادتِ دارین تصور کرتے تھے۔

اس فرقہ بندی نے اسلام کا ناحق خون کر دیا۔ علماء ہی اس اختلاف کا سبب ہو رہے ہیں اور جاہل لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ یہ خونریزی اور تباہی یہاں تک ہی بس نہیں بلکہ اس سے بھی گذر کر کئی اور فرقے عالمِ وجود میں آ رہے ہیں۔ ایک طرف اہلحدیث، دوسری طرف معتزلہ، تیسری طرف صوفیا وغیرہ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ حیرانی تو اس بات کی ہے کہ فروعی اختلاف نے اصولی اختلاف کا رنگ لے لیا ہے۔ مذاہب اربعہ اور اہلحدیث کا آپس میں اس قدر بیر ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان

لوگوں کی مسجدیں الگ الگ بنی ہوئی ہیں اور حقیقتاً اُن لوگوں کی مسجدوں کے دروازوں پر نہایت ہی جلی الفاظ میں ''مسجد حنفیاں''، ''مسجد اہلحدیث'' لکھا ہوتا ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ایک فرقہ والا دوسرے فرقہ والا کی مسجد میں نماز ادا نہیں کرتا۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ اگر بھولے سے کسی حنفی نے اہلحدیث امام کے پیچھے نماز پڑھ لی ہے تو معلوم ہونے پر اسے باطل کر کے پھر از سرِ نو ادا کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ لوگ کافر ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح اگر کسی اہلحدیث نے حنفی امام کے پیچھے پڑھی ہے تو وہ بھی بعد میں اسے باطل کر دیتا ہے۔ یہ کس قدر شرمناک افعال ہیں جو آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں۔

اس سے بھی گزر کر ایک اور سبب زوال یہ ہے کہ خود غرض اور حریص ملاّؤں نے اس دین الہیّہ کو تباہ کر دیا ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے من گھڑت مسائل کو رواج دیا ہے جو کہ نہ قرآن اور نہ حدیث سے ثابت ہوتے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ اپنی مٹھیا گرمانے کے لیے اپنے پنے گروہ بنائے ہوئے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مولوی صاحب قادر بخش صاحب ہیں تو انہوں نے ایک گروہ ''قادری'' بنایا ہے اور جو لوگ اس کے سلسلۂ غلامی میں منسلک ہیں، ''قادری'' کہلاتے ہیں۔ انہیں اجازت نہیں کسی شخص کے پیچھے نماز ادا کریں جو قادر بخش صاحب کے مریدوں میں سے نہ ہو۔ اب چونکہ ان لوگوں کے خیالات کو مولوی صاحب نے اس قدر ڈھالا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی اور عالم کی صحبت کا فیض حاصل نہیں کر سکتے اس لیے انہیں ایسے ایسے لایعنی مسئلے بتائے جاتے ہیں جنہیں وہ امنّا و صدّقنا کہتے ہیں اور مولوی صاحب کو خدا اور رسولؐ سے بھی بڑھ کر جانتے ہیں، اور جس طرح ہوتا ہے اسے خوش رکھتے ہیں۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، معتزلہ، اہل حدیث وغیرہ وغیرہ فرقے تو کوئی معنی بھی رکھتے ہیں لیکن ان حشرات الارض کی طرح پھیلتے ہوئے مولویوں کے فرقے اسلام کے لیے ناسور کا حکم رکھتے ہیں۔ ایک ایک شہر میں سینکڑوں اس قسم کے فرقے پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ ایک محلہ میں جائیں اور اگر وہاں دس گھر ہیں تو دسوں ہی دس مختلف مولویوں کے زیر اقتدار ہیں اور اپنے پیشوا مولوی کی حمایت میں دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ مولوی صاحب جان بوجھ کر کسی دوسرے مولوی کو زک دینے کے لیے اس کے مکان کے قریب ہی اس کے خیالات پر نفرین بھیجنے کے لیے مجلس وعظ منعقد کرتے ہیں اور اپنے مریدوں کے گروہ کو لٹھّوں وغیرہ سے مسلح کر کے ساتھ لے جاتے ہیں، اور اعلانیہ اس دوسرے مولوی صاحب کی توہین کرتے ہیں۔ جب ان مولوی صاحب کے معتقدین کو بھی خبر ہوتی ہے تو وہ بھی مسلح ہو کر مقابل آجاتے ہیں اور پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ کوئی زخمی ہوتا ہے، کوئی مارا جاتا ہے۔ سو ایک طرف سے

احولات میں جاتے ہیں سود دوسری طرف سے اور مولوی صاحبان کی دستار عدالت میں خوار ہوتی ہے، اور خود ذلیل و خوار ہو کر ننگِ اسلام ثابت ہوتے ہیں۔

یہ تو علماء کا حال ہے۔ اب ایک اور گروہ کی طرف متوجہ ہو جیو جس نے اسلام کا ستیاناس کر دیا اور اس پاک دین میں ایسی ایسی لغو باتوں کو داخل کیا ہے جس سے اگر بُت پرستی کا گمان کیا جائے تو بجا ہے۔ یہ گروہ نفس پرست، حریص اور خود غرض پیروں کا ہے۔ اس سے کسی صاحب کو یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نفسِ تصوّف کی شان میں خدانخواستہ کوئی بُرا کلمہ کہہ رہے ہیں۔ حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت داتا گنج بخشؒ اور حضرت بابا فرید گنج شکر تصوّف کے وہ آفتاب عالمتاب تھے جن کے دمِ قدم سے اسلام کی روشنی ہندوستان میں چمکی۔ یہ انہیں کے طفیل ہے کہ ہم آج سات کڑور مسلمانوں کو اس سرزمین میں دیکھتے ہیں ورنہ محمود غزنوی اور محمد غوری کی تلواروں نے کتنے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا تھا۔ یہ بزرگانِ دین اسلام کے لیے مایہ ناز تھے۔ ان کے درس میں ہزاروں لوگ حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے تھے۔ غرباء و مساکین کے لیے لنگر خانے جاری رہتے تھے اور نہایت ہی پابند صلوٰۃ اور متشرع تھے۔ انہوں نے اپنے حیرت انگیز طرزِ عمل سے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور شاہانِ وقت ان کی صحبت کو سعادت سمجھتے اور ترستے کہ یہ پاک لوگ ان کی طرف بھی ایک نگاہِ لطف کریں۔ لیکن وہ امارت و وجاہت سے اس قدر مستغنی تھے کہ کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے آج کل کی طرح کوئی حلقۂ مریدان قائم نہیں کیا ہوا تھا کہ سال کے سال دورہ کر کے ان لوگوں سے مال بٹور کر اپنی منزل گاہ میں تشریف لا کر عیش و عشرت میں مشغول ہوتے۔ ان کا تو فیض عام جاری تھا۔ جو آتا، استفادہ حاصل کر کے چلا جاتا۔ ان کی کیا بات تھی، وہ تو مجدّدِ اسلام کہے جا سکتے ہیں جنہوں نے اسلام کی خوبیاں دنیا کے سامنے پیش کر کے اس کی حقانیت لوگوں میں پھیلائی۔ ہمارا خطاب ان لچر، فضول اور بیہودہ پیروں کی طرف ہے جو دنیا کی تمام لغویات کا مادیٰ و ملجا ہیں۔ نماز کے نزدیک وہ نہیں جاتے، شراب و زنا میں ہر وقت مبتلا رہتے ہیں، اور عیش و عشرت ان کا شغل ہے۔ اگر بفرض محال ان میں سے کوئی شرحِ اسلام کا پابند بھی ہوتا ہے تو اسے لالچ و حرص کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ لوگوں کا مال غصب کر کے اپنے دوزخ شکم کے پُر کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور مریدوں کو ایسی تعلیم دیتا ہے جو کہ اصولِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ ہم نے اس قسم کے کئی پیروں کو دیکھا ہے کہ مریدان کی خدمت میں حاضر ہو کر سر بسجود ہو کر ان کے سامنے اظہارِ عقیدت کرتے ہیں اور ایسے طریقہ سے ان کی خدمت میں بیٹھتے ہیں کہ ایک ناچیز بندہ خدا کے

حضور بھی سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ان کے ہاں سال کے سال جلسۂ جشن منعقد ہوتے ہیں اور قوال ورنڈیاں ناچ ورنگ کرتی ہیں۔

چونکہ ان پیروں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان کا حلقۂ مریداں وسیع ہوتا جائے اس لیے قرآن وحدیث میں عجیب عجیب طریقہ کے ساتھ تحریف کرکے ثابت کرتے ہیں کہ ہر ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وسیلہ ڈھونڈے،یعنی پیر بنائے۔ہم حیران ہیں کہ اسلام کے زمانۂ اول میں کہیں یہ پیری مریدی کا سلسلہ دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔آنحضرتؐ کے بعد خلفائے راشدین کا زمانہ آیا۔ان کے بعد اسلام کا بڑا عروج کا زمانہ رہا لیکن اس قسم کی بات نہ کہیں پڑھنے میں آئی ہے اور نہ کہیں سننے میں آئی ہے۔آخر وسیلہ کے کیا معنی ہیں۔کیا رسولؐ، قرآن وحدیث کے سوا کوئی اور وسیلہ بھی ہو سکتا ہے۔ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ پیر لوگ ایک مرید کے اندر کیا ڈال دیتے ہیں۔سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اکثر حالتوں میں وہ کسی کام کاج کا نہیں رہتا۔انہیں ایسے ایسے محنت شاقہ کے وظائف وغیرہ بتلائے جاتے ہیں کہ جن کے روزانہ کرنے سے ان کے قویٰ معطّل ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جاتے ہیں۔بعض پیروں کی تعلیم تو دنیا سے ہی کنارہ کش ہونے پر مبنی ہوتی ہے۔غرضیکہ کیا کیا بیان کیا جائے۔فی زمانہ اسلام کو ان خود ساختہ پیروں کی ہستی سے بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے۔انہیں کے دم سے اسلام میں قبر پرستی کا وجود آیا،انہیں کے سبب سے قبروں پر ناچ رنگ کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں،انہیں کی مہربانیوں سے رنڈیوں کو فروغ ہوا، اور وہ جلیل القدر اور عظیم الشان بزرگان دین اور اولیائے کرام کے مقدّس مزارات پر مجرے کرنے لگیں۔ایک دفعہ راقم کا بھی پیرانِ کلیر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔وہ حضرت علاؤ الدین صابری کلیری کے عرس کا زمانہ تھا۔آپ کے مزار مقدس پر رات دن رنڈیوں کا مجرا ہوتا تھا اور سجادہ نشین صاحب مجلس قوال منعقد کرکے صدر میں ایک شان سے بیٹھ کر نغمۂ روح فزا کے سروں سے لُطف اٹھاتے اور سر کو حرکت دیتے۔معلوم نہیں کہ اس میں کونسی عبادت مدِّ نظر رکھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ مزارات پر ہزاروں روپیہ چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے اور ہٹّے کٹّے وہاں کے مجاور جو کہ مفت کا مال کھا کر اور بیکاری میں وقت گزار کر سانڈ کی طرح مست پھرتے ہیں،ایسے ایسے بیہودہ اور لغو افعال کے مرتکب ہوتے ہیں کہ دیکھ کر شرم آتی ہے۔

ایک اور مضحکہ انگیز ان دنیا پرست اور حریص پیروں کی بات ہے جو کہ نفرین کے سوا لوگوں سے (سمجھ دار) اور کسی بات کا خراج وصول کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ان میں سے کئی ایک شراب اعلانیہ پیتے ہیں اور اپنے

مریدوں کو بھی چرس، بھنگ، افیون اور شراب کے عادی بناتے ہیں، اور اگر ان کے مریدوں سے پوچھا جائے کہ آپ کے پیر کی یہ حالت ہے تو وہ نہایت ہی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضرت حافظ شیرازیؒ نے جو اس شعر میں پیر کے ہر ایک فعل اور قول کی پیروی جائز قرار دی ہے۔

بمے سجّادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

افسوس آتا ہے ان کی ہستی پر کہ قرآن مجید تو کہتا ہے کہ شراب سے بچو لیکن حضرت حافظؒ کے شعر کو قرآن مجید سے بہتر سند متصوّر کر کے شراب اڑاتے ہیں اور پھر اس بے حیائی کے کام میں دیدہ دلیری سے کام لیتے ہیں۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ قطع نظر اس نقصان کے جو کہ شیعہ سنی کے جھگڑوں، مذاہب اربعہ اور اہلحدیث کے تنازعوں اور قضیوں نے اسلام کو پہنچایا ہے، ان آج کل کے خود ساختہ پیروں نے تو اس کی رہی سہی طاقت کو بالکل بیکار کر دیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قرآن ہمارے پاس ہے، حدیث ہمارے پاس ہے، صحابہؓ کا طرزِ عمل ہمارے سامنے نمونہ کا کام دیتا ہے، پھر ان کی طرف کیوں رجوع کیا جائے۔ اور اگر ان پیروں کا یہی دعویٰ ہے کہ ہم اسلام کی خدمت کرتے ہیں تو وہ بغیر اس کے نہیں کر سکتے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو اپنے حلقۂ غلامی میں ایسا جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ پھر وہ کسی اور کام کے رہتے ہی نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ پیر پرست ہیں وہ نہایت ہی تنگ خیال ہوتے ہیں، اور کبھی بھی اپنے آپ کو اس بات کا موقعہ ہی نہیں دیتے کہ دوسرے لوگوں کے اعتقادات کا مطالعہ کر کے ان کا اپنے اعتقادات سے مقابلہ کیا جائے۔

آئے دن کا ایک اور جھگڑا ہے جس کے سبب سے شرمناک نتائج پیدا ہو رہے ہیں اور جس کے باعث لوگوں کی طبعیت کسی اور طرف ہی لگی ہوئی ہے۔ اسلام تو ایک ایسا مذہب ہے جس نے تنگ خیالی کو پاس تک نہیں پھٹکنے دیا لیکن بعد کے زمانہ کے ملاؤں نے اس میں عجیب عجیب طریقوں سے تفرقہ کا بیج بویا۔ آج کل جو بات لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان کرا رہی ہے وہ نہایت ہی حقیر ہے اور جس کا اثر اعتقادات پر بالکل نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا بلند آواز سے ''آمین'' اور ''رفع یدین'' کا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ بلند آواز سے ''آمین'' نہیں کہنا چاہیے لیکن دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ضرور کہنا چاہیے اور اس معمولی بات نے ان کے درمیان اس قدر طول کھینچا ہے کہ کئی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مسجدوں میں ہی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتّھا ہو گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ مقصود تو عبادت الٰہی ہے لیکن اب اس مسئلہ کے متعلق لوگوں کو اس قدر چڑ

ہو گئی ہے کہ ایک دوسرے کی ضد کے باعث اسے نہایت ہی زیادہ وقعت دی جارہی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ''آمین'' کے بلند یا آہستہ کہنے سے نماز پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ یہ دونوں فعل سرور کائناتؐ کے ہوں گے۔ آپ نے بلند آواز سے اور آہستہ آواز سے بھی کہنے کا حکم دیا ہوگا۔ جو لوگ بلند آواز سے کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں اگر ان کے پاس ثبوت ہے تو وہ سچے ہیں اور جو لوگ آہستہ کہنے کا دعویٰ پیش کرتے ہیں اگر ان کے پاس ثبوت ہے تو وہ بھی سچے ہیں، بشرطیکہ ان کے ثبوت روایت صحیحہ پر مبنی ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر تنازعہ کا ہے کا ہے۔ اگر دونوں طرف کے لوگ اس پر غور کریں تو عقدہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ یاد رکھو، آنحضرتؐ نے بہت سے احکام مصلحتِ وقت کے لحاظ سے جاری کیے تھے اور پھر جب مقصد نکل آیا تو اسی کے متعلق دوسری قسم کا حکم جاری کر کے انہیں منسوخ کر دیا یا وہ خود بخود تقاضائے وقت سے منسوخ ہو گئے۔ اور بعض تو ایسے ہیں کہ آپ کے بعد آپ کے صحابہؓ نے اجتہاداً ان کو ترک کر دیا کیونکہ اب ان کی ضرورت نہ رہی۔ ایک چھوٹی سی مثال ہم آپ کے روبرو پیش کرتے ہیں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ صحابہؓ کس طرح عقل سے کام لیتے تھے، اگرچہ وہ کئی باتوں کو محض آنحضرتؐ کی یادگار سمجھ کر قائم رہنے دیتے تھے۔ حج کے ارکان میں رمل ایک رکن ہے، یعنی طواف کرتے وقت پہلے تین دوڑوں میں آہستہ آہستہ دوڑتے چلتے ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ رسول اللہؐ جب مدینہ سے مکہ میں تشریف لائے تو کافروں نے مشہور کیا کہ مسلمان ایسے کمزور اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے۔ سرور کائناتؐ نے یہ سن کر رمل کا حکم دیا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا لیکن حضرت عمرؓ نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب ہم کو رمل سے کیا غرض۔ اس سے مشرکوں کو رعب دلانا مقصود تھا سو ان کو خدا نے ہلاک کر دیا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے رمل کے ترک کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن پھر آنحضرتؐ کی یادگار سمجھ کر رہنے دیا۔ عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک دفعہ کہا گیا کہ لوگ رمل کو سنّت سمجھتے ہیں۔ آپ نے کہا، غلط سمجھتے ہیں۔ اس سے آپ خود نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کیا صورت ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ آپ نے پہلے کفار کو رعب دکھانے کے لیے بلند آواز سے ''آمین'' کہنے کا حکم دے دیا ہو لیکن پھر بعد میں اس کی ضرورت نہ رہی ہو، اگرچہ جو لوگ بلند آواز سے ''آمین'' کہتے ہیں ان پر کوئی الزام نہیں عاید ہو سکتا۔ لیکن اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے کہ اس چھوٹی سی بات کے لیے دست و گریبان کیوں ہوا جاتا ہے اور محض اس کی ادائیگی کے لیے الگ الگ مسجدوں کا بن جانا کس قدر شرمناک امر ہے۔ اسے بھی رمل کی طرح خیال کیجیے اور آنحضرتؐ کی یادگار سمجھ کر قائم رکھیئے۔ لیکن جو لوگ بلند آواز سے نہیں کہتے انہیں تو بُرا نہ کہیے۔ آخر بات کونسی ہے جس پر

اس قدر جھگڑا کر کے اپنی طاقتوں کو برباد کیا جاتا ہے۔

''رفع یدین'' کے متعلق بھی اسی طرح کا ایک واقع مشہور ہے جو کہ رمل کے ساتھ پورے طور سے مطابقت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسلام کے شروع زمانہ میں بعض لوگ دین اسلام قبول کر لیا کرتے تھے لیکن دل سے بت پرستی کی طرف ہی مائل تھے۔ جب وہ منافقانہ طور سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آتے تو اپنی بغلوں میں بُت دبائے ہوتے تھے۔ جب آنحضرتؐ کو ان کے اس قسم کے منافقانہ فعل سے آگاہی ہوئی تو آپ نے ''رفع یدین'' کا حکم دیا تاکہ ہاتھ بلند کرنے سے ان کی حقیقت کا انکشاف ہو جائے اور وہ شرمندہ ہو جایا کرتے تھے۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ رمل کی طرح اس کا بھی ادا کرنا ایک یادگار کے طور سے ہے ورنہ بعد میں جبکہ مشرکین تباہ ہو گئے تو اس کی کچھ ضرورت نہ رہی۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے ایسے لایعنی جھگڑوں کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کی ترقی کے ذرائع سوچیں اور ناحق اپنے شرمناک طرز عمل سے اس پاک مذہب کی ہلاکت کے درپے نہ ہوں۔

جس قدر مذکورہ صدر اسباب ہم نے بیان کیے ہیں ان کے وقوع پذیر ہونے کے وجوہات بھی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ اسلام کا مرکز ہل گیا ہے اور خلافت کا عالم گیر اقتدار ضائع ہو گیا ہے۔ اگر دنیائے اسلام کے مسلمان ایک ہی مرکز پر جمع ہوتے اور ایک ہی خلیفہ کے زیر سایہ رہتے تو اس قسم کی لغو باتیں اسلام میں کبھی بھی داخل نہ ہوتیں۔ جب خلفاء کمزور ہو گئے اور خود غرض لوگوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کر کے ایک عالم گیر نفاق پیدا کر دیا تو آہستہ آہستہ ان کی سلطنتیں برباد ہو گئیں اور مسلمان کسی خلیفہ کے ماتحت بھی نہ رہے تو اس قسم کی قابل اعتراض باتیں ظہور میں آنے لگیں اور بیدینی و فسق و فجور حد سے بڑھ گئے کیونکہ لوگوں سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں رہا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مغربی تعلیم نے لوگوں پر اس قدر اثر کیا کہ وہ مذہب کے بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔ جس کا جی چاہا من گھڑت باتیں رواج دینا شروع کر دیں، اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ کئی ایک لوگ اسلام کو جواب دے کر دہریہ بن گئے اور اپنے لغو خیالات سے لوگوں کے اعتقادات کو بھی بگاڑ دیا۔ حضرت منصور حلاجؒ کا قصّہ کون نہیں جانتا۔ آپ نہایت ہی خدا رسیدہ بزرگ تھے لیکن جب آپ نے اعلانیہ طور سے اپنی زبان سے ایک خلافِ شرع کلمہ نکالا تو خلیفۂ وقت مجبور ہو گیا اور آپ کو فتویٰ کفر دینا ہی پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منصور دار پر چڑھائے گئے۔ یہ کس لیے؟ اس لیے کہ خلیفۂ وقت کا حق ہے کہ وہ ان فرائض کی ادائیگی کے لیے ہر وقت مستعد رہے جو کہ از روئے قانونِ اسلام اس پر لازمی ہیں۔ لیکن آج آپ دیکھیں کہ

کس قدر لوگ ہیں جو کہ اسلام کے اصولوں پر کاربند ہیں۔ ہزاروں آپ ایسے دیکھیں گے جو کہ خدا تعالیٰ کی ہستی سے ہی انکار کرتے ہیں اور آنحضرتؐ کی حدیث پر تمسخر اڑاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اس زمانہ میں بے جا آزادی حاصل ہے، کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے، اور خلیفۂ وقت کا کوئی اقتدار نہیں۔ اقتدار کیا معنی، وہ ہے ہی نہیں۔ اسلام نے مرتد کی سزا قتل قرار دی ہے۔ آج ایک ایک شہر میں جاؤ، ہزارہا مرتدین دیکھو گے اور مسلمان کہلانے کے ساتھ ایسے ایسے ناجائز حملات مذہب پر کریں گے کہ سننے کی تاب نہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ یہ صرف اسی لیے ہے کہ مغربی تعلیم نے ان پر اس قدر اثر کیا ہے کہ وہ مذہب کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ یورپ میں کروڑہا لوگ ایسے ہیں جو کہ خدا کو مانتے ہی نہیں۔ جب ایسے لوگوں کی صحبت کا اثر ہم پر ہوگا تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ یہی دہریّہ پن۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کی آزادی نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ہر ایک قوم میں غدّار اور خود غرض لوگ موجود ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس بات کے مواقع کی تاک میں ہوتے ہیں کہ کس طرح بے جا طور سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ جب تک اسلام کی باگ زبردست ہاتھوں میں رہی یہ لوگ دبے رہے اور ان کی دال کسی طرح بھی نہ گل سکی۔ لیکن جونہی خلفاء کمزور ہو گئے اور طوائف الملوکی کے ساتھ اسلام پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا تو ان لوگوں کو بھی موقع ہاتھ آ گیا اور اب انہوں نے اپنے دل کے بخار نکالنے شروع کر دیئے، اور نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی خدا بن گیا، کوئی مسیحؑ، کوئی مہدی موعودؑ اور کوئی نبی۔ انہوں نے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا اور تفرقہ پردازی کو وہ ترقی دی کہ ایک ایک گھر میں دس دس مختلف عقیدہ کے لوگ اس وقت پائے جاتے ہیں۔ اگر باپ احمدی ہے تو بیٹا اہلحدیث، بھائی حنفی، ماموں چکڑالوی ہے، تو چچا دہریہ۔ غرضیکہ خلافت کے عالمگیر اقتدار کے ضائع ہونے نے ایک طوفان بدتمیزی برپا کیا ہوا ہے۔

یہ تو خاص بات تھی، اب عام حالت لیجیے۔ آپ سو میں سے پانچ مسلمان بھی ایسے نہیں پائیں گے جو مذہب کے پابند ہوں۔ فرقہ بندی کا تو یہ حال ہے کہ اپنے اپنے فرقہ کی حمایت میں جان تک سے دریغ نہیں کرتے لیکن جب ان کی حالت اصول مذہب کے عملی صورت میں لانے کے لیے معلوم کی جائے تو کچھ بھی نہیں۔ نماز شاید ہی کوئی پڑھتا ہو، روزے کے نام سے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، زکوٰۃ دینا تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ ہاں البتہ مکروہات کے متعلق ان سے پوچھا جائے تو پوری پوری واقفیت ہے۔ اعلانیہ شراب خانوں میں جاتے ہیں اور شراب کے نشہ میں چُور ہو کر بازاروں، کوچوں اور دوکانوں کے سامنے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ کتّے ان کے منہ چاتے ہیں اور ٹانگیں اٹھا کر ان کے دہانوں میں پیشاب کرتے ہیں۔ شہر شہر زناخانے کھلے ہیں، پوشیدہ

طور سے نہیں بلکہ اعلانیہ زنا کیا جاتا ہے۔ کون کونسے افعال ذمیمہ ہیں جن کے مسلمان مرتکب نہیں۔ قرآن مجید نے ان باتوں سے نہایت ہی تاکید کے ساتھ منع کیا ہے لیکن حکومت کی طرف سے بھی ان کی مخالفت کے سامان ضروری ہیں۔ خلیفہ کی ہستی ہی اسی لیے قائم کی گئی ہے کہ ایسے جرائم کے مرتکبین کو سخت سزائیں دی جائیں لیکن یہاں تو یہ حال ہے کہ آزادی کا زمانہ ہے، کوئی کسی کا مزاحم ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک شخص اپنے فعل کا مختار ہے جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی کھو رہے ہیں۔ جب تک اعلانیہ طور سے ان میں فسق و فجور کی روکاٹ نہیں ہو گی مسلمان روز بروز قعر تنزل میں گرتے جائیں گے۔ اگر وہ چاہیں کہ ایک طرف تو اس قسم کے مکروہات میں مبتلا ہونے کے لیے ان کے سامنے مواقع ہوں اور دوسری طرف ان کے لیے ''ترقی کرو، ترقی کرو'' کی چیخ پکار کی جائے تو یاد رکھیئے، یہ بالکل ناممکن ہے۔ محض کوٹ پتلون کسنے، ڈاڑھی منڈانے، شراب نوشی کرنے، چھری کانٹے سے کھانا کھانے، یورپ کی تعلیم حاصل کرنے اور ڈگریوں کی دولت سے مالا مال ہونے سے ہرگز ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔ غدر کے بعد سے ہی نہایت شدومد کے ساتھ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلمان ترقی کریں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اس وقت سے لے کر اب تک انہوں نے کونسی ترقی کی ہے۔ اگر اس زمانہ میں کہیں خال خال خدا رسیدہ اور متقی لوگ ملتے تھے تو اب وہ عنقا کا حکم رکھتے ہیں۔ اب تو ترقی کے یہی آثار ہیں کہ ہر طرف مغربی تعلیم کے دلدادہ نظر آ رہے ہیں جنہیں خدا اور سولؐ کے نام سے سروکار نہیں اور مسجدوں میں نماز کے لیے جانے کو عار سمجھتے ہیں۔ ان کی موچھوں کی شان دیکھو تو اکڑی ہوئی، ایک مغرب کی طرف جا رہی ہے اور دوسری مشرق کی طرف۔ وہ کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کرتے کہ اسلام نے سادگی میں ہی رہ کر کس قدر ترقی کی اور تمام دنیا کو مسخر کر لیا، اور وہی گدڑی پوش، درویش منش، بادیہ نشین بدوی اپنی خدا رسیدگی اور سادہ پن سے امصار و دیار کے مالک بن گئے۔

فی زمانہ ترقی کے دلدادہ اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ اسلام کے اصول ہی سرے سے تبدیل ہونے چاہییں۔ ایک کہتا ہے کہ عورتوں کو بھی مغربی تعلیم دلوانی چاہیے۔ جب تک وہ مغربی تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ ہوں گی ترقی ناممکن ہے۔ دُوسرا کہتا ہے، پردہ ترقی کے مانع ہے، اگر مسلمانوں میں اس کا رواج ہٹا دیا جائے، عورتیں اعلانیہ باغوں، تھئیٹروں اور تماشہ گاہوں میں مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر پھریں تو بہت جلدی ترقی کی صُورت نکل آئے گی۔ تیسرا کہتا ہے کہ نماز نے بہت کچھ ترقی کو روکا ہوا ہے کیونکہ وہ یورپین لوگوں سے میل جول نہیں ہونے دیتی اس لیے کہ کوٹ پتلون، ٹائی کا سر، بوٹ اور انگریزی ٹوپی سر پر ہو گی تو نماز کی ادائیگی

مشکل ہے، اور سجدہ کرتے وقت پتلون میں سلوٹ پڑنے سے بد نما ہو جاتی ہے۔ اور اگر انگریزی لباس ترک کر دیا جائے تو صاحب لوگ پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے ترقی نہیں ہو سکتی۔ اب تو ایک اور فیشن خدا کے فضل سے مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ پہلے تو اسلامی تعلیم کے خلاف وہ ڈاڑھی منڈواتے تھے، اب اُن میں سے جو کوئی ولایت میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آتا ہے تو علمی ڈگری کے ساتھ ایک اور ڈگری اپنے ساتھ لاتا ہے، یعنی کہ ڈاڑھی کے ساتھ اس کی موچھیں بھی چٹ ہوتی ہیں اور اپنی وضع و قطع سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اب مسلمان عورتیں ہو گئے ہیں۔

ان نوجوانوں پر جب اس قسم کا اعتراض کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس تنگ خیالی نے اسلام کو کمزور کر دیا ہے۔ مذہب کی ترقی عقیدہ سے ہے نہ کہ لباس اور شکل و شباہت سے۔ یاد رکھو، اگر تمہارا ظاہر درست نہیں تو تمہارے باطن کو کوئی بھی نہیں دیکھتا، ہر ایک کی نظر تمہارے ظاہر پر پڑے گی اگرچہ تمہارا باطن نہایت ہی گندہ ہے۔ اگر تمہاری شکل سے اسلامی شان ظاہر ہو گی تو تمہارا ہر ایک گرویدہ ہو گا اور تمہاری باتوں پر کان دھرے گا۔ تمہاری ڈاڑھی اور موچھیں چٹ ہوں گی، کوٹ و پتلون زیب بر ہوں گے، کالر ٹائی لگی ہو گی، تم خواہ کس قدر منہ سے اسلام کی شان میں بڑے بڑے الفاظ نکالو گے کوئی بھی ان کی پرواہ نہیں کرے گا اور حقیقتہً ان کا اثر بھی نہیں ہو گا۔ تمہاری قطع وضع سے یہی ترشح ہوتا ہے کہ تم عیسائی ہو، تمہیں تو مسلمان کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں تو یقین ہے کہ اس کم بخت پتلون نے کئی نمازیوں کو بے نماز کیا ہے۔ کئی لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو پہلے نماز پڑھا کرتے تھے لیکن پتلون نے انہیں عبادت الٰہی سے روک کر ہمیشہ کے لیے بے دین کر دیا۔

مغربی تعلیم حاصل کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ اپنے مذہب اور مذہبی رسومات کو ترک کر دیا جائے یا یورپ جا کر ڈگریاں حاصل کرنے سے یہ مدعا نہیں کہ اپنی قومی روایات کو یک قلم چھوڑ کر اپنی ہستی کو ہی ضائع کر دیا جائے، بلکہ اس سے مطلب یہ ہے کہ ترقی یافتہ یورپ سے مستفید ہو کر اپنی قوم کی ترقی کے ذرائع سوچے جائیں۔ کتنے انگریز ہیں جو یہاں ہندوستان آ کر تمہاری رسومات اختیار کرنے کے ساتھ ہی تمہارے ملک کا لباس اختیار کر لیتے ہیں۔ یاد رکھو، اگر تم اسلام کی روایات زندہ نہیں رکھو گے، ہر گز ہر گز ترقی نہیں کر سکو گے۔ جب تک اپنے مذہب پر پورے طور سے کاربند نہیں ہو گے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکو گے بلکہ دن بدن خوار اور خستہ حال ہی رہو گے۔ جب سے تم نے اپنے مذہب کو چھوڑا ہے بتاؤ کس قدر ترقی کی ہے۔ سلطنتیں تم کھو بیٹھے، عزّت تم برباد کر چکے، کسی جگہ بھی تمہیں پناہ کی جگہ میسّر نہیں ہے۔ ہر ایک قوم تم سے نفرت کرتی ہے۔

جن کے تم دلدادہ ہو وہی تم سے کتّوں سے زیادہ سلوک کرتے ہیں اور پھر بھی تمہیں سبق حاصل نہیں ہوتا اور اسی دھن میں ہو کہ بس ترقی ہی ترقی ہے۔ اگر ننانوے فی صدی مسلمان انگریزی پڑھ لیں، ہم کہتے ہیں، خاک ترقی ہے۔ تنزل ہی تنزل ہے۔ علم کے حاصل کرنے سے کوئی منع نہیں کرتا۔ تمہیں تو تمہارے آقائے نامدار نے حکم دیا ہے کہ اگر چین میں علم ہو تو اس کی تلاش میں وہاں جاؤ۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ اپنی قطع وضع نہ بگاڑو، اور صحابہؓ کا نمونہ بن کے دکھاؤ۔

سب سے آخر میں نہایت ہی یاس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے خود ساختہ لیڈر اسلام کی تباہی اور بربادی کا باعث ہو رہے ہیں۔ لیڈر کے معنی ہیں ''رہنما'' یا ''رہبر''۔ کسی قوم کی رہنمائی کے لیے ایک ایسا شخص ہونا چاہیے جو پورے طور سے نمونہ ہو۔ یہ فارسی مثل ''او کہ خود گمراہ است کرا رہبری کند'' اس شخص پر صادق آتی ہے جو زمانہ کی برائیوں اور لغویات کا ملجا وماویٰ ہے، پھر لاکھ دو لاکھ کے مجمع میں کھڑا ہو کر نہایت ہی بلند آواز میں چیخ پکار کرتا ہے، ''ہمیں اسلام کی ترقی کے لیے یہ کرنا چاہیے، ہم اس طرح اپنے حقوق لیں گے، ہم اس طور اپنے مذہب کی حفاظت کریں گے، ہمارے بزرگوں نے اسلام کی یہ خدمات کیں، ہمارے خلفائے راشدین نے اپنے زہد واتقا سے دنیا کو مطیع کر لیا، وغیرہ وغیرہ۔'' آپ اس کی تقریر کو ملاحظہ کیجیے اور اس کی ہیئت کو دیکھیے۔ بعض دفعہ تو اس کی ڈاڑھی چٹ ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں ڈاڑھی اور مونچھیں ندارد۔ اس کے باطن کا یہ حال ہے کہ کبھی بھولے سے نماز کے نزدیک تک نہیں گیا، کلمہ منہ سے نہیں نکالا، رات دن شراب کے نشہ میں چور رہتا ہے، اور زنا سے تو اسے کبھی فراغت ہی نہیں۔ جس قوم کا اس قسم کا رہبر ہے تو اس کا خدا حافظ ہے۔ اور اب تو لیڈر حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ جو نوجوان ایل ایل بی کی ڈگری یا ولایت سے بیرسٹری کی سند لاتا ہے اس کا نام جھٹ قومی لیڈروں کے رجسٹر میں داخل ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس قسم کا مجموعۂ قوانین مرتب کیا ہوا ہے جس پر ہر حالت میں عمل پیرا ہونا ہر ایک فرد اسلام کے لیے ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک کسی فرضیت کو ترک کرتا ہے تو گویا اس کا فعل قابل اعتراض ہے، چہ جائیکہ ایک ایسا شخص جو کہ قوم کی لیڈری کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر مذہب کے جکڑ بندوں سے آزاد ہے تو اس کی کیا حالت ہونی چاہیے۔ اسلام کو تو اس بات نے تباہ کیا کہ ''گندم نما جو فروش'' لیڈر پبلک سٹیج پر آکر منہ سے کچھ الا پتے ہیں اور ان کے دل میں کچھ اور خیالات ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے تعرّض نہیں کہ ہمارے لیڈر کے خیالات کس قسم کے ہوں۔ اگر اُس کی ظاہری ہئیت قابل اعتراض ہے تو ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ

اسے اپنی حالت کے درست کرنے کے لیے کہا جائے۔ غور کیجیے کہ ایک شخص اپنے میں وہ خوبیاں نہیں رکھتا جو اس میں مسلمانوں کے سردار بننے کے لیے ضروری ہیں تو اس کا دعویٰ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ میں مسلمانوں کا لیڈر ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے آئے دن کے مصائب نے اس قدر حواس باختہ کر دیا ہوا ہے کہ جو کوئی بھی انہیں تسلی آمیز الفاظ کہتا ہے خواہ منافقانہ ہی ہوں وہ اس کے عیوب بُھول کر اس کے گرویدۂ احسان ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اس طرح بجائے اصلاح کے خرابی کا خطرہ ہے۔ ان کا فرض ہے کہ جرأت سے کام لیں اور اسلام کی ان سچی روایات کو پیش نظر رکھیں جو کہ ایسے موقعوں پر ان کے لیے رہبری کا کام دے سکتی ہیں۔ کیا آپ کو جبلہ ابن الیہم غسّانیوں کے آخری بادشاہ کا واقعہ یاد نہیں جو کہ مسلمان ہو گیا تھا اور حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لیے مدینہ آیا تھا۔ صحابیؓ نے کس جرأت و آزادی سے اس کا آزار بند (تہمت) کھول دیا حالانکہ وہ ایک بادشاہ تھا اور عرب کے نہایت ہی معزز خاندان کا رکن تھا، لیکن اس غریب مسلمان کو اظہار راستی سے کوئی چیز بھی نہ روک سکی۔ جب بادشاہ اسے تھپّڑ مارتا ہے تو مقدمہ حضرت عمرؓ کے پاس پیش ہوتا ہے اور واقعات پر غور کرنے کے بعد صحابی کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو، وہ ابھی ابھی مسلمان ہوا تھا۔ اگر اس کے اس قسم کے فعل سے درگزر کیا جاتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی، لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اسلام کے ایک اصول کو اس کی خاطر مسترد نہیں کیا گیا۔

برعکس اس کے آپ کے بھرے مجمع میں آپ کے سامنے پلیٹ فارم پر ایک مسلمان آتا ہے لیکن اس کی ہر ایک بات اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اور وہ اس شان سے آتا ہے کہ تمہارے دینی اور دنیوی امورات کا کفیل بنتا ہے۔ آپ کچھ غور نہیں کرتے کہ خود تو اُسے دینی کاموں سے مس نہیں اور آپ کے لیے دفتر نصائح کھولتا ہے، پھر کس طرح ممکن ہے کہ آپ کی ترقی ہو سکے۔ اسلام آپ کو سکھلاتا ہے کہ آپ اس پر اس صحابیؓ کی طرح اعلانیہ اعتراض کریں اور اسے فوراً اپنے سامنے سے ہٹا دیں، اور ذلیل کر کے مجمع سے نکلوا دیں۔ جب یہ حالت ہو گی تو دوسروں کو بھی سبق حاصل ہو گا اور وہ بھی اپنا طرز عمل درست کریں گے اور اس وقت تک مسلمانوں کے لیڈر بننے کا دعویٰ نہیں کریں گے جب تک پورے طور سے اسلامی اوصاف سے اپنے آپ کو متصف نہیں پائیں گے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے کاموں میں کیسی برکت ہوتی ہے۔